راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 18واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

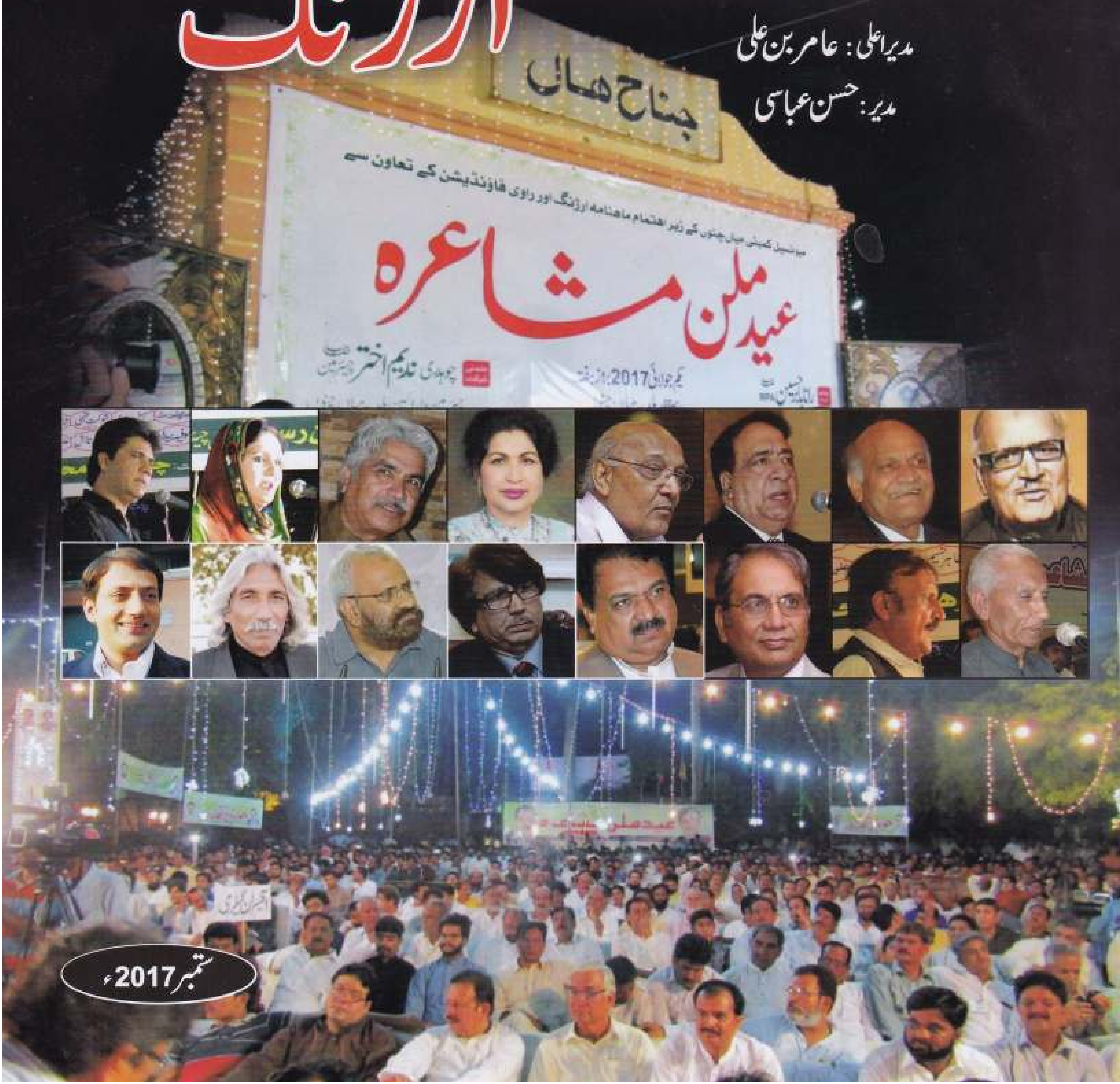

ستمبر 2017ء

عامر بن علی جو وزیر موصوف کے برادر خورد اور ہمارے دیرینہ مداحوں میں شامل ہیں اور جن کے اصرار پر میں نے اس مشاعرے میں شامل ہونے کی حامی بھری تھی۔ خود بھی ایک عمدہ شاعر ہیں لیکن وہ میزبانی میں ہی اس قدر مصروف تھے کہ اپنے کلام سے انہوں نے ہمیں محروم رکھا۔ اتنے شعراء کو سنبھالنا چونکہ اکیلے آدمی کا کام ہی نہیں تھا، اس لیے مشاعرے کی نقابت کا فریضہ ڈاکٹر صغریٰ صدف اور وصی شاہ نے ادا کیا۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ عید ملن مشاعرے کا ہر سال اہتمام وانعقاد کیا جائے گا۔ مقامی شعراء عام طور پر بے وزن شعر ہی سنایا کرتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ میاں چنوں کے شعراء بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ یہ ایک کامیاب اور یادگار مشاعرہ تھا جسے اس کے سامعین بھی یاد رکھیں گے اور شامل ہونے والے شعراء بھی۔

ظفر اقبال بشکریہ روزنامہ ''دنیا''

جاپان میں کاروبار کی وجہ سے عامر بن علی اور اس کے بھائیوں کا گھر جاپانیوں کا گھر کہلاتا ہے۔ اس کے وسیع سبزہ زار میں مہمانوں کے لیے ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا اور میزبان جس خلوص اور توجہ سے ہر مہمان کی خاطر داری کر رہے تھے وہ ایک بہت روح پرور منظر تھا کہ آج کل تو کھانے کی دعوتوں میں ویٹر اور بیرے تک سر سے بوجھ سا اُتارنے کا تاثر دیتے ہیں۔ مشاعرہ گاہ میں بلدیہ کے عہدیدار اور شہر کے دیگر عمائدین ہاتھوں میں ہار لیے شاعروں کے منتظر تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر صغریٰ صدف اور وصی شاہ نے انجام دیے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ سپین، فرانس، ناروے اور مسقط سے بھی شعرا نے شرکت کی۔ جب کہ بھارت سے مدعو شاعر ویزے کے مسائل کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔ ایک اور بہت اچھی بات یہ دیکھنے میں آئی کہ مہمانوں کی تعداد اور احترام کو سامنے رکھتے ہوئے میزبان شعراء نے رضا کارانہ طور پر شاعروں کی بجائے سامعین کے طور پر شرکت کا اعلان کر دیا اور بہت خوش دلی سے آخر تک مشاعرے میں شریک رہے۔

امجد اسلام امجد بشکریہ روزنامہ ''ایکسپریس''

میاں چنوں کا یہ سالانہ عظیم الشان مشاعرہ احسن انتظامات، شعرا کی نمائندگی اور سامعین کی تعداد کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جانے والا مشاعرہ ہے۔ اس مشاعرے نے یہ ثابت کیا ہے کہ اب بھی ماضی کی طرح شاندار مشاعرے کروائے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ملک میں دہشت گردی کے خطرات موجود ہیں۔ ملک سیاسی طور پر غیر مستحکم ہے مگر ایسی تقریبات عوام الناس کو خوشی اور سکون دے سکتی ہیں۔ یہ کام بڑے شہروں کے بجائے ضلعی اور تحصیل کی سطح پر کروانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر غافر شہزاد بشکریہ روزنامہ ''اوصاف''

رانا برادران اور چیئرمین میاں چنوں کا ایثار اپنی جگہ لائق ستائش تو ہے ہی لیکن پاکستان بھر سے نمائندہ شاعروں کا اور مختلف ممالک میں بسے پاکستانی شاعروں کا از حد جوش وخروش کے ساتھ اس عالمی عید ملن مشاعرے میں پہنچنا، اس تمام کامیابی کا سہرا معروف شاعر عامر بن علی کے سر جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام آباد سے کراچی اور ناروے سے فرانس، مسقط، قطر تک اپنی محبت کی خوشبو اور اپنی شخصیت کا جادو بکھیر رکھا ہے۔ انہیں جتنی بھی مبارک باد دی جائے وہ کم ہے۔

راجا نیر بشکریہ روزنامہ ''الشرق''

بلاشبہ ماحول اور انتظامات نے مغلیہ دور میں ہونے والے پرتکلف مشاعروں کی یاد کو تازہ کر دیا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک مدت تک اس مشاعرہ کی یادیں ذہنوں میں تازہ رہیں گی لیکن عامر بن علی نے یہ اعلان کر کے کہ یہ مشاعرہ ہر سال منعقد کیا جائے گا میرے اس خیال کو ختم کر دیا کہ اس مشاعرہ کو مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ یقیناً ہر نیا مشاعرہ پہلے سے بڑھ کر اپنی خوبصورت یادوں کے نقوش دلوں پر ثبت کرے گا۔ ہم سب عامر بن علی اور ان کے احباب کی ادب سے اتنی گہری محبت اور اس خوبصورت روایت کو قائم رکھنے کی کوششوں کی پائیداری اور ہمیشگی کے لیے دعا گو ہیں۔

لبنیٰ صفدر بشکریہ روزنامہ ''نوائے وقت''

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 19 ستمبر 2017ء شمارہ نمبر 9

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{ مجلس ادارت }

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ لبنیٰ صفدر

{ مجلس مشاورت }

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

محمد ادریس لاہوری (ناروے) ◉ ڈاکٹر سید ندیم حسین (ناروے) ◉ ناز اوکاڑوی

کمپوزنگ ◉ زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر ◉ نعمان حسن : 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ◉ محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 ناز اوکاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد ، ۲

منقبت و سلام ، ۳

مضامین: میاں چنوں کا یادگار عید ملن مشاعرہ

○ میاں چنوں کا مشاعرہ / ظفر اقبال ، ۴

○ دین و دنیا ساتھ ساتھ / امجد اسلام امجد ، ۵

○ میاں چنوں کا یادگار عالمی سالانہ مشاعرہ / ڈاکٹر غافر شہزاد ، ۷

○ عالمی عید ملن مشاعرہ / راجا نیّر ، ۹

○ میاں چنوں کا عید ملن مشاعرہ / لبنیٰ صفدر ، ۱۴

○ میاں چنوں کا یادگار عالمی مشاعرہ / عامر بن علی ، ۱۶

شعری گوشے:

○ ثمینہ سید، بہنام احمد، قمر چودھری، شمشاد شاد، آصف نیاز ، ۱۸-۲۲

مضامین

○ مدینہ یاد آتا ہے / خورشید بیگ میلسوی ، ۲۳

○ زاویوں کی پہچان / عاشق رحیل ، ۲۵

○ آ کھ غلام فرید الف / نسیم سحر ، ۲۸

○ ایاز محمود ایاز کی شاعری / میاں عامر محمود ، ۳۰

○ محبت بھوت ہے شاید / ناز اوکاڑوی ، ۳۲

○ یک دم ڈبی (طنز و مزاح) / احمد سعید ، ۳۴

افسانے

○ نسلوں کے دکھ / ادریس لاہوری (ناروے) ، ۳۵

○ تورجا / سعدیہ بتول ، ۳۷

○ انٹرویو / جیم فے غوری ، ۳۹

شاعری ، ۴۳

مختصر ادبی خبریں ، ۴۵

تبصرۂ کتب ، ۴۶

نامہ ہائے احباب ، ۵۰

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد

مرے لباس کے ہر تار کا محافظ ہے
جو کائنات کے اسرار کا محافظ ہے
وہی خدائے بزرگ و جلیل ہے میرا
محافظوں کی جو دستار کا محافظ ہے
اُسی سے نطق و سخن میں ہے لذتِ الفاظ
جو میرے لہجۂ اظہار کا محافظ ہے
یہ کائناتِ سخن اس کے دم سے ہے قائم
وہ حرف حرف کے معیار کا محافظ ہے
وہی خدا جو محافظ ہے میری نیندوں کا
وہ میرے دیدۂ بیدار کا محافظ ہے
مجال کیا کہ بغیر اُس کے حکم کے بولوں
مری زباں، مری گفتار کا محافظ ہے

شاہدہ لطیف/اسلام آباد

حمد

وہ عدو ہو کہ یار صاحب کا
ہر کوئی زیرِ بار صاحب کا
ایک صندوق موتیوں سے بھرا
جب بھی کھولا انار صاحب کا
پھول نکلا ہے میرا اُنگلی سے
جب بھی توڑا ہے خار صاحب کا
بے قراری ہے کائنات میں کیوں
کس نے لوٹا قرار صاحب کا
لاوا آتش فشاں نے اُگلا ہے
کچھ تو نکلا غبار صاحب کا
آنسوؤں کی زباں ہے سرکاری
نام رو کر پکار صاحب کا
جتنا کر سکتا ہے تماشا کر
وقت اچھا گزار صاحب کا
دُکھ سے اتنا بھرا ہوا ہوں میں
کیسے جھیلوں گا پیار صاحب کا
آخری دیکھیں کون ہوتا ہے
میں ہوں پہلا شکار صاحب کا

حسن عباسی/لاہور

نعت

اُتریں وہ لفظ حرمتیں جن کی عیاں رہیں
نعتیں حضور پاکؐ کی عنبر فشاں رہیں
دیکھے ہر آنکھ گنبدِ خضرا کو ہر گھڑی
اُڑتے پرندے جیسے سوئے آشیاں رہیں
یہ التجا کریں گے رسالت مآبؐ سے
قسمت سے آ گئے ہیں یہاں پر یہاں رہیں
راہِ مدینہ جنتِ عالی کی راہ میں
وابستہ کیوں نہ اس سے ہر اک قلب و جاں رہیں
کلیاں درودِ پاک پڑھیں مسکرا اُٹھیں
یادِ نبی سے کھلتے ہوئے گلستاں رہیں
سارے جہاں میں جائے اماں ایک ہے بس ایک
پھر ہم مدینہ چھوڑ کے جائیں، کہاں رہیں
ضعفِ یقیں نہ پاؤں کی زنجیر بن سکے
آقا! درونِ دل مرے جذبے جواں رہیں
دل کو ریاضؔ شوق ہے اب جبہ سائی کا
پیشِ نگاہ، سنگِ درِ آستاں رہیں

سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال

نعت

روشنی کو ملی روشنی آپؐ سے
زندگی کو ملی زندگی آپؐ سے
ہر چمن دے رہا ہے گواہی یہی
ہر کلی پا رہی تازگی آپؐ سے
دو جہاں کو غموں سے رہائی ملی
پا رہا دو جہاں ہر خوشی آپؐ سے
اُس کی بگڑی بنی دیکھتے دیکھتے
ہو گئی جس کی بھی دوستی آپؐ سے
مانگنے کا سلیقہ نہیں ہے اُسے
مانگنے آ رہا اُمتی آپؐ سے
آپ کے نام پر جان دے دوں گا میں
جان میری نہیں قیمتی آپؐ سے
بات امجدؔ دیے کی ہو تم کر رہے
چاند بھی پا رہا چاندنی آپ سے

امجد شریف

منقبت

وصیِ ختمِ رُسُل شاہِ ولایت بے شک
جس کی گفتار میں کردار میں احمدؐ کی جھلک
اُن کو مانا ہے محمدؐ کی وصی حق کا ولی
آ نہیں سکتی کبھی میرے عقیدے میں لچک
دل کی گہرائیوں سے نامِ علیؑ یوں نکلے
نعرے کی گونج سنائی دے نجف اشرف تک
شاملِ ذکرِ محمدؐ ہے ترا ذکرِ بلند
ہے رفعنا لک ذکرک میں کسی کو کوئی شک
تو نے دکھلائی جنھیں راہِ ہدایت مولیٰ
ترے ممنون ہوں، انسان ہوں یا جن و ملک
جب بھی ہوتا ہوں گرفتار کسی مشکل میں
درِ اقدس پہ ترے دیتا ہوں آ کر دستک
رنگ اُڑ جاتا ہے دشمن کا فضائل سن کر
رُخِ مومن پہ جھلکتی ہے مودت کی چمک
حاملِ قوت یزداں تھا لقب شیرِ خدا
اُس کی مرغوب غذا نانِ جویں اور نمک
اُس نے محنت کی کمائی کو دیا اوجِ کمال
اُس نے مزدور کی عظمت کو بڑھایا بے شک
کون ہے علم و شجاعت میں برابر تیرے
کون ہے عدل کے منصب پہ ترا ہم ایک
زندگی پر تری قرباں ہے رسولؐ صادق
بندگی پر تری نازاں ہے خدائے بارک
فاصلہ تو نے جو بتلایا رہے گا قائم
تاقیامت کرۂ ارض سے خورشید تلک
قومِ موسیٰؑ ابھی بھولی نہیں خیبر کی شکست
قتلِ مرحب کی ہے باقی دلِ کافر میں کسک
سچ ہے دریائے سخاوت کا شناور ہے علیؑ
اُن کے در سے نہیں جاتا کوئی خالی بے شک
کیسے ممکن ہے تہی دست تونگر ہو جائے
حاتم انگشت بدنداں ہے تو حیراں ہیں ملک
کتنی رنگین ہے بخشے ہوئے اونٹوں کی مُہار
جیسے ساون میں نظر آتی ہے خوش رنگ دھنک
رقص یوں کرتا ہے سائل نے جو پائی ہے مراد
جیسے یکلخت خوشی پر کوئی جاتا ہے بہک
ترے الطاف میں ہے رنگِ رسولؐ اکرم
ترے انصاف میں عدلِ الٰہی کی جھلک
ہے مری شاعری پابندِ ولائے معصوم
مجھ سے اُمید ثنا غیر کی اے لے پالک
ہے مرے جذبہ اخلاص وفا کی تذلیل
ہے مرے وعدۂ میثاق کی توہین و ہتک
قبرِ اطہر پہ تری سجدۂ تعظیم کروں
مری خواہش کی نہ پڑ جائے منافق کو بھنک
جس نے بھی تیری ولایت کا نہ اقرار کیا
سونگھ سکتا نہیں وہ گلشن جنت کی مہک
ضربتِ تیغِ علیؑ دیکھیے یوم الخندق
وہ عبادت کا ہمالہ ہے محبتوں کی کمک
کوئی اُس جیسا نہیں آس کی گنہ گاروں کی
کوئی اُس جیسا نہیں جنسِ وفا کا گاہک
نہ کیا یاد کسی نے بھی سقیفہ میں انھیں
دعویٰ عشق نبیؐ اور علیؑ سے چشمک
یاد رہتا ہے نہ قرآن نہ فرمانِ رسولؐ
مرضِ بغض و حسد ہوتا ہے کتنا مہلک
مبنی ہے آیہ بلّغ پہ ہی اعلانِ غدیر
کس کو معلوم نہیں، کیا ہے ہمارا مسلک
ہے مدینے سے کوئی عازمِ خیبر منصورؔ
میں بھی سلمانؓ کی طرح دیکھتا ہوں سوئے فلک

مظفر حسن منصورؔ/ جوہر آباد

سلام

دل میں جب سے غمِ شبیرؑ بسائے ہوئے ہیں
قابلِ رشک مقدر کو بنائے ہوئے ہیں
مدحتِ سبطِ پیمبرؐ میں جو مصروف ہیں ہم
پھول یہ اُن کی محبت کے کھلائے ہوئے ہیں
دھیان ہٹتا ہی نہیں کرب و بلا سے میرا
اس طرح سے وہ مرے ذہن پہ چھائے ہوئے ہیں
آخرت میں مری بخشش کی ضمانت ہوں گے
یہی آنسو جو مری آنکھ میں آئے ہوئے ہیں
اُن مصائب کی کہانی مجھے بھولے کیسے
جن کے منظر مری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں
حوصلہ دیکھ براہیمؑ! مرے مولاؑ کا
نوجواں بیٹے کے لاشے کو اُٹھائے ہوئے ہیں
گو بہت دور ہیں ہم روضۂ زینبؑ سے رضاؔ
اُن کی یادوں کے دیے گھر میں جلائے ہوئے ہیں

علی رضا/ ساہیوال

میاں چنوں کا مشاعرہ

ظفر اقبال/لاہور

یہ ایک عید ملن مشاعرہ تھا جس کا اہتمام صوبائی وزیر رانا بابر حسین نے کیا تھا۔ شعراء کے حساب سے تو تھا ہی سامعین کے حوالے سے بھی یادگار مشاعرہ تھا۔ سامعین کی اتنی بڑی تعداد کبھی نہیں دیکھی۔ مشاعرہ تین بجے تک جاری رہا اور لطف یہ ہے کہ کوئی ایک بھی شخص اختتام سے پہلے اُٹھ کر نہیں گیا۔ ایک طرف خواتین بیٹھی تھیں، ان میں سے بھی وقت سے پہلے کوئی اُٹھ کر نہیں گئی۔ اس ڈسپلن کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ رانا صاحب خود بہ نفس نفیس مشاعرہ گاہ میں براجمان تھے۔ اس طرح کے مشاعرے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں مرحوم کروایا کرتے تھے جن کی روایت کو رانا صاحب نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ شعراء کی تعداد کوئی چالیس سے کم کیا ہو گی جن میں خواتین شاعرات بھی شامل تھیں۔ مشاعرے میں ناروے، لندن، آسٹریلیا اور کراچی سے آئے شعرا بھی شامل تھے اور اگر اس میں کوئی بھارتی شاعر بھی ہوتا تو اسے ایک عالمی مشاعرہ کہا جا سکتا تھا۔

سینئر شعرا میں امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، بابا نجمی، باقی احمد پوری، تیمور حسن تیمور، خالد شریف، قمر رضا شہزاد، ڈاکٹر اختر شمار اور عباس تابش نمایاں تھے۔ جبکہ خواتین شعراء میں ڈاکٹر صغریٰ صدف، بسمل صابری، صوفیہ بیدار، رخشندہ نوید، شاہدہ دلاور شاہ، نیلما ناہید درانی اور دیگران، جبکہ مزاح کا رنگ انور مسعود، خالد مسعود خاں، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، گل نوخیز اختر اور محسن مگھیانہ نے جمائے رکھا۔ جدید شاعر سعود عثمانی کے کلام نے بھی لطف میں اضافہ کیا۔ عامر بن علی جو وزیر موصوف کے برادر خورد اور ہمارے دیرینہ مداحوں میں شامل ہیں اور جن کے اصرار پر میں نے اس مشاعرے میں شامل ہونے کی حامی بھری تھی۔ خود بھی ایک عمدہ شاعر ہیں لیکن وہ میزبانی میں ہی اس قدر مصروف تھے کہ اپنے کلام سے انہوں نے ہمیں محروم رکھا۔ اتنے شعراء کو سنبھالنا چونکہ اکیلے آدمی کا کام ہی نہیں تھا، اس لیے مشاعرے کی نقابت کا فریضہ ڈاکٹر صغریٰ صدف اور وصی شاہ نے ادا کیا۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ عید ملن مشاعرے کا ہر سال اہتمام و انعقاد کیا جائے گا۔ مقامی شعراء عام طور پر بے وزن شعر ہی سنایا کرتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ میاں چنوں کے شعراء بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ یہ ایک کامیاب اور یادگار مشاعرہ تھا جسے اس کے سامعین بھی یاد رکھیں گے اور شامل ہونے والے شعراء بھی۔

دور تک سایۂ شہرت ہے، ظفرؔ
کاٹ کر یہ بھی شجر دیکھنا ہے

❀❀❀

غزلیات/ ریحانہ قمر (امریکہ)

مرنا پڑتا ہے بار بار مجھے
یوں نہ اے زندگی گزار مجھے
جانے کیوں دیر سے میں بیٹھی ہوں
جانے کس کا ہے انتظار مجھے
دیکھ کر اک ستارۂ تنہا
یاد آیا وہ بے شمار مجھے
وہ مرے ساتھ ہو تو صحرا بھی
نظر آتا ہے لالہ زار مجھے
کیسے سمجھاؤں میں قمرؔ اُس کو
ہے کہاں دل پہ اختیار مجھے

....

اک عمر بعد آ کے بھی ساری نہ جا سکی
اندر سے میرے راج کماری نہ جا سکی
کیسے سنوارتی میں ترے سب جہان کو
مجھ سے مری پلک ہی سنواری نہ جا سکی
اک عمر رو کے دیکھ لیا میں نے ہجر میں
گردِ ملال دل سے اُتاری نہ جا سکی
حیرت ہے مار دیتے ہیں انسان کو یہ لوگ
مجھ سے تو ایک چیونٹی بھی ماری نہ جا سکی
اب تک میں اک وصال کے نشے میں ہوں قمرؔ
آنکھوں کی پتلیوں سے خماری نہ جا سکی

....

سبھی حریفوں کی اور سارے حاسدین کی خیر
میں مانگتی ہوں خدا سے مخالفین کی خیر

دین و دنیا......ساتھ ساتھ

امجد اسلام امجد

عزیزی عامر بن علی نے کوئی ایک ماہ قبل سے یکم جولائی کی شام میاں چنوں میں ایک مشاعرے کے لیے محفوظ کرا رکھی تھی مگر اب جو دعوت نامے میں شعراء کے ناموں کی فہرست دیکھی تو وہ نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر کی حدود سے بھی آگے کی طرف رواں دواں تھی اور غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق بیس کے لگ بھگ مقامی شاعر اس کے علاوہ تھے۔ معلوم ہوا کہ مشاعرہ عامر کے بھائی اور مقامی ایم پی اے رانا بابر حسین کی سرپرستی میں بلدیہ اور عامر بن علی کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''ارژنگ'' کے تعاون سے پیش کیا جا رہا ہے۔ برادرم ظفر اقبال صدر مشاعرہ تھے اور انور مسعود، عطاء الحق قاسمی اور مجھے مہمانانِ خصوصی کا اعزاز دیا گیا تھا۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں چونکہ بڑے مشاعرے کبھی کبھار ہی ہوتے ہیں، اس لیے عام طور پر مختلف نوع کے دباؤ اور مقامی مصلحتوں کی وجہ سے شعرا کی فہرست طویل تر ہوتی چلی جاتی ہے جس کا منفی اثر مشاعرے کے معیار اور سامعین کی تعداد اور دلچسپی پر پڑتا ہے لیکن یہ مشاعرہ اس اعتبار سے مثالی اور غیر معمولی تھا کہ رات دس بجے سے لے کر صبح تقریباً چار بجے تک کھلے میدان میں گرمی کے باوجود دو ہزار کے قریب سامعین اپنی نشستوں پر جمے رہے جبکہ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے کھڑے ہو کر سننے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی،

سعود عثمانی اور میں شوکت فہمی کی کار میں اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے تقریباً ساڑھے چار بجے پہر میاں چنوں پہنچ گئے۔ اس تعجیل کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں کچھ وقت نزدیکی قصبے تلمبہ میں مولانا طارق جمیل کے ساتھ گزارنا تھا کہ اس کے لیے ایک دن قبل انہوں نے خاص طور پر نہ صرف فون کیا تھا بلکہ متعلقہ انتظامات بھی کر رکھے تھے۔ سو برادر عزیز رانا بابر حسین اور ان کے دو دوست آنکھیں فرش راہ اور گاڑیاں سٹارٹ کیے ہمارے منتظر تھے۔ مولانا طارق جمیل سے میری پہلی بالمشافہ ملاقات 2007ء میں حج کے دوران ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ دو مرتبہ میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے لیکن گزشتہ تین چار برس میں ان سے رابطہ ان کے مختلف ٹی وی پروگراموں اور لیکچرز ہی کی معرفت چلا آ رہا تھا۔ کچھ عرصے سے ٹی وی پر قدرے کم مگر سوشل میڈیا پر بہت زیادہ اور انتہائی خطرناک انداز میں فرقہ پرستی اور مسلکی اختلافات کو جو ہوا دی جا رہی ہے اس کے زیر اثر اب ہر دین کی بات کرنے والے کو دین سے پہلے اور کہیں زیادہ مسلک اور متعصبانہ فرقہ بندی کے حوالے سے دیکھا اور پسند یا ناپسند کیا جاتا ہے۔ ذاتی طور پر تو میں اکبرالہ آبادی کے اس اعلان کے حق میں ہوں کہ

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

لیکن بدقسمتی سے ہمارے عمومی معاشرتی رویے ''فالتو عقل'' کے متاثر ہیں جس کی وجہ سے آپ کو بالخصوص سوشل میڈیا پر مختلف ممالک کے مولویوں، ذاکروں اور پیروں کے ایسے ایسے روپ دیکھنے کو ملتے ہیں جو بیک وقت افسوس ناک بھی ہیں اور شرم ناک بھی۔ ایسے میں مولانا مودودی، ڈاکٹر اسرار احمد اور ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کے بعد جن دو مذہبی سکالرز کو جزوی اختلافات سے قطع نظر احترام اور توجہ کے ساتھ قبول عام کا شرف حاصل ہوا ہے وہ مولانا طارق جمیل اور جاوید احمد غامدی صاحب ہی ہیں۔ ڈاکٹر طاہر القادری کا نام بھی اس فہرست میں آ سکتا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات اس قدر تبدیل ہو گئی ہیں کہ اب وہ عالم دین کے طور پر کم اور سیاستدان کی حیثیت سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ مولانا طارق جمیل کے خاندان کا تلمبہ میں خاصا وسیع اور آبائی زمینداره ہے۔ ان کے مدرسے سے ملحقہ خوبصورت مسجد میں عصر کی نماز کے بعد ہمیں ان کے کشادہ ڈیرے پر لے جایا گیا جس کے سامنے ہی ان کا رہائشی مکان ہے۔ یہاں ان سے ڈیڑھ دو گھنٹے کی بہت دلچسپ خوشگوار اور معلومات اور ایمان افروز ملاقات رہی۔ ایک نزدیکی کمرے میں پرتکلف چائے کا انتظام تھا۔ جس کا انداز فرشی نشست کا تھا جہاں سے مغرب کی نماز کے لیے دوبارہ مسجد گئے اور اس وعدے کے

ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے کہ اب ملاقاتوں کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں کیا جائے گا۔ ذوق کا ایک شعر ہے:

واجب القتل اس نے ٹھہرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے

مگر اس محفل کی سب سے خوبصورت بات یہ تھی کہ آیتوں اور روایتوں کے کثیر اور بے تکلف استعمال کے باوجود گفتگو کا موضوع اور مقصد انسان دوستی، اختلاف رائے کی برداشت، خیر کی تلاش اور اپنی تہذیب کے حُسن کی حفاظت اور اس کی خوشبو کو ہمہ وقت ساتھ رکھنے کے گرد ہی گھومتی رہی۔ مولانا طارق جمیل کی گفتگو کا انداز اس قدر موثر اور متاثر کن ہے کہ ان کے مسلک اور بیان کردہ روایات سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی جادو بیانی اور جذباتی فضا میں (وقتی طور پر ہی سہی) کھو سے جاتے ہیں۔ مجھے غامدی صاحب کے حوالے سے ان کی یہ رائے سن کر بہت خوشی ہوئی کہ بات کرنے کا ڈھب اور دیکھنے والے کا انداز نظر اپنی جگہ اصل بات یہ ہے کہ جس کی جو اور جتنی بات دل اور دماغ کو اچھی لگے اور قرآن و سنت کے مطابق ہو اسے لے لینا چاہیے۔ یعنی زور اتفاق کے امور پر ہونا چاہیے نہ کہ اختلافی مباحث پر۔

جاپان میں کاروبار کی وجہ سے عامر بن علی اور اس کے بھائیوں کا گھر جاپانیوں کا گھر کہلاتا ہے۔ اس کے وسیع سبزہ زار میں مہمانوں کے لیے ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا اور میزبان جس خلوص اور توجہ سے ہر مہمان کی خاطرداری کر رہے تھے وہ ایک بہت روح پرور منظر تھا کہ آج کل تو کھانے کی دعوتوں میں ویٹر اور بیرے تک سر سے بوجھ سا اُتارنے کا تاثر دیتے ہیں۔ مشاعرہ گاہ میں بلدیہ کے عہدیدار اور شہر کے دیگر عمائدین ہاتھوں میں ہار لیے شاعروں کے منتظر تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر صغریٰ صدف اور وصی شاہ نے انجام دیے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ سپین، فرانس، ناروے اور مسقط سے بھی شعرا نے شرکت کی۔ جب کہ بھارت سے مدعو شاعر ویزے کے مسائل کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔ ایک اور بہت اچھی بات یہ دیکھنے میں آئی کہ مہمانوں کی تعداد اور احترام کو سامنے رکھتے ہوئے میزبان شعراء نے رضاکارانہ طور پر شاعروں کی بجائے سامعین کے طور پر شرکت کا اعلان کر دیا اور بہت خوش دلی سے آخر تک مشاعرے میں شریک رہے۔ جس پر مہمان شعرا اور سامعین نے مل کر ان کا شکریہ ادا کیا اور یوں ہم 24 گھنٹے کے اندر اندر دین اور دنیا دونوں کی خوشگوار فضا میں سانس لیتے ہوئے واپس اپنے اپنے گھر کو پہنچے۔

کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں مقیم اردو اور پنجابی کے
نامور شاعر ظفر اعوان کا پہلا شعری مجموعہ

زیویں سدھراں دی

مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا ہے

صفحات: 160   قیمت: 400 روپے

ملنے کا پتہ: نستعلیق پبلی کیشنز، لاہور
0300-4489310

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: 24-j ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

میاں چنوں کا یادگار عالمی سالانہ مشاعرہ

ڈاکٹر غافر شہزاد/لاہور

پنجاب میں دم توڑتی مشاعروں کی روایت میں وقفوں وقفوں سے ایسی اچھی تقریبات کی خبریں ملتی رہی ہیں کہ جن کے سبب اپنی رائے پر نظر ثانی کرنا پڑتی ہے۔ میاں چنوں میونسپل کمیٹی کے زیر اہتمام ماہنامہ ارژنگ اور راوی فاؤنڈیشن کے تعاون سے منعقد ہونے والا یہ سالانہ مشاعرہ کئی حوالوں سے یادگار رہا۔ اس مشاعرے کی روح رواں عامر بن علی جو عید کے موقع پر اپنے آبائی شہر تشریف لائے۔ انہوں نے جاپان میں رہتے ہوئے ہی مشاعرے کے انتظامات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور شاعروں سے رابطے کرنے لگے۔ لاہور میں ڈاکٹر صغریٰ صدف، حسن عباسی اور ابرار ندیم ان کے نمائندوں کے طور پر حق دوستی ادا کر رہے تھے۔ عامر بن علی ایک خوبصورت شاعر، نفیس شخصیت اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ انہوں نے تمام شعرا کو ذاتی طور پر فون کر کے مشاعرے میں باضابطہ مدعو کیا۔ پھر یاددہانی کا فون بھی آیا۔ مشاعرے میں 70 کے قریب میاں چنوں سے باہر سے مدعو کیے گئے۔ شعرا کے نام دعوت نامے اور شہر میں سڑکوں پر لگے فلیکس پر جلی حروف میں لکھے گئے تھے۔ میاں چنوں کے رہنے والے کسی شخص سے بھی آپ کہیں کہ جاپانیوں کے گھر جانا ہے۔ وہ آپ کو نہایت محبت سے عامر بن علی کے گھر چھوڑ آئے گا۔ مقامی لوگوں کی یہ محبت عامر بن علی کے خاندان نے کئی دہائیوں کی ریاضت کے بعد کمائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پلاک لاہور میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پچیس سے زائد لاہور کے شعرا کا قافلہ میاں چنوں ڈھائی بجے دوپہر فلائنگ کوچ پر ڈاکٹر صغریٰ صدف کی معیت میں روانہ ہوا۔ میاں چنوں میں ہمارے میزبان میونسپل کمیٹی کے چیئرمین چوہدری ندیم اختر اور ممبر قومی اسمبلی رانا بابر حسین اپنی محبتوں کے پھول نچھاور کرنے کے لیے ہمہ وقت موجود رہے اور تمام انتظامی معاملات کو احسن طریق سے سرانجام دیا۔

میاں چنوں ساڑھے چھ بجے پہنچے تو سڑکوں پر لگے بڑے بڑے فلیکس دیکھ کر یقین کرنا پڑا کہ آج میاں چنوں میں اہم ترین سرگرمی مشاعرہ ہی ہے۔ عامر بن علی کے گھر میں پورے پنجاب سے قافلے لینڈ کر رہے تھے۔ کھانے کے لیے میزیں بڑے لان میں سج چکی تھیں۔ وہیں ہم خالد شریف کے ساتھ ایک طرف صوفوں پر بیٹھے تھے جہاں بسمل صابری بھی آ گئیں۔ وہ مسلسل خالد شریف سے گفتگو کر کے اپنی فتوحات اور مشہوری کے زمانہ کو ایک ریٹائرڈ آرٹسٹ کی طرح سچ اور جھوٹ کو ملا کر سناتی رہی۔ خودنرگسیت تو ہر شاعری میں ہوتی ہے مگر لاہور سے دور ساہیوال میں رہائش پذیر بسمل صابری کو ابھی بھی یقین ہے کہ وہ ادبی حلقوں اور عوام میں مقبول ہیں۔ ملاقات کا ایک ایسا سلسلہ تھا کہ ایک ہی جگہ پر پنجاب کے تمام نمائندہ شعرا موجود تھے۔ ہم سے پہلے انور مسعود پہنچ چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ظفر اقبال اور امجد اسلام امجد بھی الگ الگ اپنے چاہنے والوں کے جلو میں تشریف لے آئے۔ آخر میں عطاالحق قاسمی بھی پہنچ گئے۔ منو بھائی بوجوہ ناسازی طبع تشریف نہ لا سکے۔ خورشید رضوی ملک میں موجود نہیں تھے۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر صغریٰ صدف اور وصی شاہ کے ذمہ تھی۔ کھانے کے بعد شعرا کو بلدیہ میاں چنوں کے سبزہ زار میں لے جایا گیا جہاں بینڈ باجے کے ساتھ ساتھ آتش بازی کا شاندار انتظام موجود تھا۔ بینڈ باجے اور آتش بازی کے مظاہرے کی رونق میں شعرا کو مشاعرہ گاہ میں لے جایا گیا۔ مشاعرے میں شرکت کے لیے یوں لگتا تھا سارا میاں چنوں شہر ہی بلدیہ کے سبزہ زار میں جمع ہو گیا ہے۔

جب ہم مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو روشنیوں سے جگمگاتا ہوا پنڈال شعرا کے لیے طمانیت کا باعث تھا۔ نشستوں پر بیٹھنے کے علاوہ بے شمار لوگ مشاعرے کے آخر تک کھڑے ہو کر شعرا کو سنتے رہے۔ اس مشاعرے کو کیبل کے توسط سے میاں چنوں کے ہر گھر میں پہنچانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا اور یوں خواتین پنڈال میں نہ آ سکی تھیں۔ انہوں نے گھر بیٹھے تمام مشاعرہ سنا۔ عامر بن علی اسٹیج پر بیٹھے بھی انتظامی معاملات کی نگرانی اور مشاعرے میں شعرا کے پروٹوکول کا خیال رکھے ہوئے تھا۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ ابتدا میں شعرا کو داد

قدرے کم مل رہی تھی۔ ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ ایسی شاعرہ تھی جس کے کلام پر سامعین کی جانب سے نہایت پرجوش داد کا سلسلہ شروع ہوا۔ فرتاش سیّد نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ ان کی شاعری اور شعر سنانے کے انداز نے سامعین کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ زیب النسا زیبی کراچی سے آئی تھی جس کا تعارف یہ کروایا گیا کہ کراچی میں ایک سڑک ان کے نام سے ہے۔ انعام الحق جاوید اور عطا الحق قاسمی شروع میں ہی اپنی حاضری لگوا کر اپنی مصروفیت کے سبب اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ ملتان والے بھی آغاز میں ہی اپنے اشعار سنا کر ملتان اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ صغریٰ صدف اور وصی شاہ کی نظامت نے مشاعرہ کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ نوجوان مشاعرے کے دوران اور بعد میں بھی انور مسعود، امجد اسلام امجد کی موجودگی میں وصی شاہ کے ساتھ سیلفیاں بنواتے رہے۔ اس لحاظ سے وصی شاہ تقریب کا مقبول ترین شاعر ٹھہرا۔ انور مسعود نے اپنے مزاحیہ قطعات سنانے کے بعد اپنی سنجیدہ شاعری سنانا شروع کر دی۔ وہ شاید اپنے بعد آنے والے صاحب صدارت شاعر ظفر اقبال کے لیے ماحول بنا رہے تھے۔ انور مسعود اس وجہ سے بھی کھل کے اپنا کلام نہ سنا سکے کہ دوران مشاعرہ ان کا پرس ان کی جیب سے کسی نے سیلفی لیتے ہوئے نکال لیا تھا۔ پرس میں رقم کے علاوہ ضروری کارڈز بھی تھے۔ البتہ اس بات کی تسلی ہوئی کہ ان کو لفافہ مشاعرے کے اختتام کے بعد ملا اور یوں وہ رقم محفوظ رہی۔ ظفر اقبال اپنے مطلعے سناتے رہے، آخر میں اپنی ایک پنجابی نظم سنائی۔ سناتے ہوئے بھول جاتے تو ان کے عقب میں بیٹھے سعود عثمانی، شوکت فہمی اور عباس تابش ان کو یاد دلا دیتے۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ سامعین نے نہایت دلچسپی اور توجہ کے ساتھ ساٹھ کے قریب شعرا کو سنا اور جب جب شعر پسند آیا داد بھی دی۔ شاعرات میں لبنیٰ صابری، زیب النسا زیبی، رخشندہ نوید، صوفیہ بیدار، نیلما ناہید درانی، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، فاخرہ انجم، ڈاکٹر صغریٰ صدف، لبنیٰ صفدر، طاہرہ سرا نے جب کہ شعرا میں عطا الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، ظفر اقبال، انعام الحق جاوید، خالد شریف، باقی احمد پوری، قمر رضا شہزاد، عباس تابش، سعود عثمانی، وصی شاہ، رضی الدین رضی، ناصر بشیر، بابا نجمی، اختر شمار، خالد مسعود خان، اقبال راہی، تیمور حسن تیمور، حسن عباسی، غافر شہزاد، راجا نیر، علی زریون، جواد شیخ، فرتاش سیّد گل، نوخیز اختر، ابرار ندیم، ممتاز راشد، نبیل انجم، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، حکیم ارشد شہزاد و دیگر شامل تھے۔ میاں چنوں کا یہ سالانہ عظیم الشان مشاعرہ احسن انتظامات، شعرا کی نمائندگی اور سامعین کی تعداد کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جانے والا مشاعرہ ہے۔ اس مشاعرے نے یہ ثابت کیا ہے کہ اب بھی ماضی کی طرح شاندار مشاعرے کروائے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ملک میں دہشت گردی کے خطرات موجود ہیں۔ ملک سیاسی طور پر غیر مستحکم ہے مگر ایسی تقریبات عوام الناس کو خوشی اور سکون دے سکتی ہیں۔ یہ کام بڑے شہروں کے بجائے ضلعی اور تحصیل کی سطح پر کروانے کی ضرورت ہے۔

غزلیات/میثم علی آغا (اٹلی)

خواب تھا دیدۂ بیدار تلک آ گیا تھا
دشت بڑھتا ہوا دیوار تلک آ گیا تھا
میں نے مجبوری میں تلوار اُٹھائی تھی میاں
ہاتھ بڑھتا ہوا دستار تلک آ گیا تھا
اب میں خاموش اگر رہتا تو عزت جاتی
میرا دشمن میرے کردار تلک آ گیا تھا
دکھ عزا خانوں کی زینت تھے سو اندر ٹھہرے
درد موسم تھا سو بازار تلک آ گیا تھا
میرے اندر کے کسی ہجر نے روکا ہے مجھے
ورنہ میں عشق میں انکار تلک آ گیا تھا
رات آنکھوں سے کوئی اشک بغاوت کر کے
مسکراتا ہوا رُخسار تلک آ گیا تھا

....

کہیں یقیں تو کہیں میں گماں کا حصہ ہوں
کہاں پڑا ہوا ہوں کس جہاں کا حصہ ہوں
تو مجھ کو حرف غلط کی طرح نکال نہیں
مرے خدا میں تری داستاں کا حصہ ہوں
مرا یہ ہونا نہ ہونے کے دکھ سے بڑھ کر ہے
میں شرمسار ہوں کون و مکاں کا حصہ ہوں
تو عرش و فرش کے مالک مجھے زمیں پہ نہ بھیج
میں جیسا بھی ہوں ترے آسماں کا حصہ ہوں
غبارِ راہ سمجھتے ہیں سارباں مجھ کو
میں سر بہ خاک ترے کارواں کا حصہ ہوں

عالمی عیدملن مشاعرہ

راجا نیّر/لاہور

قارئین! رمضان المبارک کے بعد عید الفطر اللہ پاک کی طرف سے شادمانیوں بھرا ایک ایسا حسین انعام ہے جسے ہر خاص و عام، چھوٹا بڑا جوش و جذبے سے سرشار ہو کر مناتا ہے۔ ادب میں بھی اس بار اہالیان و مقتدرانِ میاں چنوں نے ایک نہایت یادگار اور خوبصورت عالمی عیدملن مشاعرہ منعقد کر کے عید الفطر کی خوشیوں کا رنگ دوبالا کر دیا۔ یہ مشاعرہ ماہنامہ ارژنگ اور راوی فاؤنڈیشن کے تعاون سے میونسپل کمیٹی میاں چنوں کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا۔ یکم جولائی بروز ہفتہ شام 6 بجے معروف شاعر، کالم نویس اور سفر نامہ نگار عامر بن علی اور اُن کے بھائی ایم پی اے میاں چنوں رانا بابر حسین، حاجی رانا عابد حسین اور رانا زاہد حسین کے گھر المعروف جاپان ہاؤس میں شعرا کرام کے چھوٹے چھوٹے قافلے مختلف شہروں سے پہنچنے لگے۔ حیرت و مسرت سے بھری آنکھیں ہر طرف شاعروں کا استقبال کر رہی تھیں۔ چیئرمین میونسپل کمیٹی میاں چنوں چوہدری ندیم اختر اور رانا بابر حسین ایم پی کے ہم راہ عامر بن علی شاعروں کو جس گرم جوشی اور محبت سے گلے لگا رہے تھے اُس سے ایک ناقابل بیان چاہت سے بھری کیفیت چہار سو ہفت رنگ خوشبو بکھیر رہی تھی۔

رانا برادران اور چیئرمین میاں چنوں کا ایثار اپنی جگہ لائق ستائش تو ہے ہی لیکن پاکستان بھر سے نمائندہ شاعروں کا اور مختلف ممالک میں بسے پاکستانی شاعروں کا از حد جوش و خروش کے ساتھ اس عالمی عیدملن مشاعرے میں پہنچنا، اس تمام کامیابی کا سہرا معروف شاعر عامر بن علی کے سر جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام آباد سے کراچی اور ناروے سے فرانس، مسقط، قطر تک اپنی محبت کی خوشبو اور اپنی شخصیت کا جادو بکھیر رکھا ہے۔ انہیں جتنی بھی مبارک باد دی جائے وہ کم ہے۔ تاہم ان کے معاونین نے بھی اپنی دن رات کی محنت سے یہ ثابت کر دیا کہ میاں چنوں ایک ایسا سنہرا شہر ہے جہاں فنون لطیفہ کی چاہنے والوں کی مناسب تعداد موجود ہے۔ رات نو بجے کے قریب انتہائی عمدہ کھانے سے فارغ ہو کر شاعروں کو ایک قافلے کی صورت مشاعرہ گاہ تک لایا گیا۔ بینڈ باجے اور ڈھول کی تھاپ کے ساتھ آتش بازی کا حسین مظاہرہ اس عیدملن مشاعرے کو پنجاب کے کسی عظیم میلے کی صورت میں بدلتا محسوس ہوا۔ شاعروں کے آگے آگے نوجوان ناچتے ہوئے اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کرتے دیکھے تو دل سے دعا نکلی کہ اے اللہ کریم تو ہمارے ملک کے ہر شہر کو ادب دوست اور امن کا گہوارہ بنا دے۔ مشاعرہ گاہ کو بہت وسیع پنڈال کی صورت میں سجایا گیا تھا۔ بہت خوبصورت اور جاذبِ نظر اسٹیج پر شعرا کرام کو بٹھایا گیا۔ جہاں ہر طرف نوجوان اپنے پُر جوش بازوؤں کا حصار باندھے شاعروں کے لیے راستہ بناتے جاتے۔ اسٹیج سے ہر شاعر کا نام تعارفی انداز میں لیا جا رہا تھا اور حقیقتاً یہ ایک عالمی سطح کا ادبی میلہ بن چکا تھا۔ کئی کیمرہ مین تصویریں اُتار رہے تھے۔ کئی ٹیلیویژن اور پی ٹی وی کے کیمرے متحرک تھے۔ ایک ڈرون کیمرہ بھی مشاعرہ گاہ کے حسن کو دوبالا کرتا پھر رہا تھا۔ ہزاروں دلوں کی دھڑکنیں یکجا دھمال ڈال رہی تھیں۔ کمپیئر مظہر بخاری نے صاحب صدارت ظفر اقبال اور مہمانانِ خصوصی عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور انور مسعود کے نام اناؤنس کیے تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اس مشاعرے کی نظامت کے فرائض معروف شاعرہ، کالم نویس ڈی جی پلاک ڈاکٹر صغرا صدف اور معروف شاعر، کمپیئر، کالم نویس وصی شاہ نے انجام دیے۔ عامر بن علی کا معروف شعر یاد آ رہا ہے۔

حسن اور حکومت سے کون جیتا سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

اس شعر کا حسن اپنی جگہ لیکن ایک سچ یہ بھی ہے کہ عامر بن علی نے اپنی محبت اور اپنی شخصیت کے حسن سے ان گنت شاعروں، ان گنت سامعین کے دلوں کو جیت لیا تھا اور یہ ایک کبھی نہ بھولنے والی تقریب کے کامیاب انعقاد کی جیت ہے۔ جسے برسوں تک یاد رکھا جائے گا۔

صاحب صدارت ظفر اقبال مہمانانِ خصوصی عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد، مہمان اعزاز انور مسعود اور ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے علاوہ جن

شعرا نے اپنا کلام اس عالمی عید ملن مشاعرے میں سنایا اُن کے نام ہیں: ڈاکٹر اختر شمار، اقبال راہی، ایاز محمود ایاز (فرانس)، بسمل صابری، باقی احمد پوری، بابا نجمی، تیمور حسن تیمور، حسن عباسی، حکیم ارشد شہزاد، خالد شریف، خالد مسعود خان، راجا نیر، رخشندہ نوید، رضی الدین رضی، زاہد شمس، سعود عثمانی، سعدیہ صفدر سعدی، سہیل عابدی، شوکت فہمی (امریکہ)، شاکر حسین شاکر، شاہدہ دلاور شاہ، صوفیہ بیدار، طاہر نسیم عباس، تابش، عزیر احمد، علی زریون، غافر شہزاد، فاخرہ انجم، فرتاش سیّد، (قطر) فہیم ضیا (مسقط)، قمر رضا شہزاد، گل نوخیز اختر، لبنیٰ صفدر، ممتاز راشد، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، نبیل نجم، ناصر بشیر، ابرار ندیم اور عامر بن علی اسٹیج پر موجود تھے۔ یہ مشاعرہ رات ساڑھے تین بجے تک جاری رہا۔ آیئے اہم شاعروں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لفظ پتوں کی طرح اُڑتے رہے چاروں طرف
کیا ہوا چلتی رہی آج مرے چاروں طرف
آسماں پر کوئی تصویر بناتا ہوں ظفر
کہ رہے ایک طرف اور لگے چاروں طرف

(ظفر اقبال)

حسن ہوتا تھا سامنے میرے
اور حسن بیان ہوتا تھا
ہے کوئی فائدہ بتانے کا
میں کبھی نوجوان ہوتا تھا

(عطاالحق قاسمی)

کرپشن اور بدامنی کے ہاتھوں
دلوں پر خوف سا طاری رہے گا
حکومت بھی یہی فرما رہی ہے
ترقی کا سفر جاری رہے گا

(انور مسعود)

کہاں آ کے رکنے تھے راستے، کہاں موڑ تھا اُسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ جو نہیں ملا اُسے بھول جا
وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں
دلِ بے خبر تجھے کیا ہوا اُسے بھول جا، اُسے بھول جا

(امجد اسلام امجد)

حُسن میں نور ہے یزداں کا خدا شاہد ہے
کب میں اس بات پر ایمان نہیں رکھتا ہوں
خود پسندی سے نکل آؤ تو مجھ سے ملنا
میں برابر کے تعلق پر یقیں رکھتا ہوں

(خالد شریف)

دُہائی دیتا رہے جو دہائی دیتا ہے
کہ بادشاہ کو اونچا سنائی دیتا ہے
تو اُس سے مانگ رہا ہے فقط غزل کی بھیک
خدا تو ملکِ سخن کی خدائی دیتا ہے

(عباس تابش)

ابر کی سمت بہ اندازِ صدف دیکھتے ہیں
غم کے مارے ہیں فقط تیری طرف دیکھتے ہیں
لوگ شاہوں پہ ابھی آنکھ رکھے بیٹھے ہیں
ایک ہم ہیں جو ابھی سوئے نجف دیکھتے ہیں

(ڈاکٹر اختر شمار)

ہر روز امتحاں سے گزارا تو میں گیا
تیرا تو کچھ گیا نہیں مارا تو میں گیا
جب تک میں تیرے پاس تھا بس تیرے پاس تھا
تو نے مجھے زمیں پہ اُتارا تو میں گیا

(سعود عثمانی)

محمد نے علی دے ناں نے کناں مان دتا اے
محمد نے علی دے ناں نے پاکستان دتا اے
محمد شہر اے جس دا علی ہے اوس دا بوہا
محمد تے علی نے علم دا وردان دتا اے

(نیلما ناہید درانی)

گلی محلے میں چھوڑ آئے تیری یادوں کو
عزیز جاتے ہیں غربت میں چھوڑ کر جیسے
بھلا یوں چھوڑتے ہیں صوفیہ کسی کو کبھی
لہو کا آخری قطرہ نچوڑ کر جیسے

(صوفیہ بیدار)

اُدھر ناکے پہ ناکہ چل رہا ہے
ادھر ڈاکے پہ ڈاکہ چل رہا ہے
اُدھر منصوبہ بندی ہو رہی ہے
اِدھر کاکے پہ کاکا چل رہا ہے

(ڈاکٹر انعام الحق جاوید)

میں ورنہ دشت کہاں پار کرنے والی تھی
یہ دشت پار کرایا شکاریوں نے مجھے

(رخشندہ نوید)

جس نے تیرے لیے یہ سویٹر بنایا ہے
اُس نے میرے لیے بھی یہ جرسی بنائی ہے
تو اُٹھ گئی ہے میز سے بوتل پئے بغیر
یہ کوک میں نے تیری ہی خاطر منگائی ہے

(ڈاکٹر محسن مگھیانہ)

آپ جیسوں کے لیے اس میں رکھا کچھ بھی نہیں
لیکن ایسا تو نہ کہیے کہ وفا کچھ بھی نہیں
میں کسی طرح بھی سمجھوتہ نہ کر سکتا
یا تو سب کچھ ہی مجھے چاہیے یا کچھ بھی نہیں

(جواد شیخ ناروے)

زندگی دوطرح کی ہوتی ہے
یا تو ایسی کہ جس کی حسرت ہو
یا پھر ایسی کہ جس سے نفرت ہو
(ممتاز راشد لاہوری)

پہلے پھول بکھرتے ہیں پھر پھل آتے ہیں
خوشحالی کے رستے میں مقتل آتے ہیں
کوئی اُٹھا کر پھر سے وہیں پہ رکھ آتا ہے
جب ہم دلدل سے کچھ دور نکل آتے ہیں
(غافر شہزاد)

غموں کو الوداع کہنا پڑے گا
کوئی دل میں ٹھکانہ چاہتا ہے
کہنے کو ہر طرف ہے بھرے شہر کا سماں
دل ہے کہ اس ہجوم میں تنہا دکھائی دے
(زیب النساء زیبی)

چھوٹا لگتا ہے آسمان بہت
اونچی ہے سوچ کی اُڑان بہت
چیز کھو جاتی ہے وہی اکثر
جس کا رہتا ہے مجھے دھیان بہت
(آفتاب وڑائچ)

میں سوچتا ہوں نہ جانے کہاں سے آ گئے ہیں
ہمارے بیچ زمانے کہاں سے آ گئے ہیں
میں شہر والا سہی تو تو گاؤں والی ہے
تجھے بہانے بنانے کہاں سے آ گئے ہیں
(علی زریون)

مٹی بھر برسات بھی کافی ہوتی ہے
ہجر کی ہو تو رات بھی کافی ہوتی ہے
خنجر سے ہی کب مرتے ہیں لوگ بھلا
مرنے کو تو بات ہی کافی ہوتی ہے
(ایاز محمود ایاز فرانس)

بہار آئی مگر دل کو چین مل نہ سکا
گلوں نے آگ لگا دی ہے آشیانے کو
جو دل کا حال ہوا ہے وہ دل ہی جانتا ہے
میں مسکرا تو رہی ہوں اُسے دکھانے کو
(بسمل صابری)

دے چکا ہے مجھے دل اذنِ سفر جانے دے
اب تو میں ہو بھی چکا شہر بدر جانے دے
آج کے بعد کبھی رات نہ ہونے دینا
آج کے بعد نہ کہنا، مجھے گھر جانے دے
(گل نوخیز اختر)

اتھرو تارا ہو سکدا اے
دکھ دا چارا ہو سکدا اے
اکو واری فرض تے نہیں نہ
عشق دوبارہ ہو سکدا اے
(ابرار ندیم)

مرے لہو سے کیا جائے راستہ روشن
مرا پھٹا ہوا کرتا علم کیا جائے
سنائی جائے کوئی داستاں محبت کی
میں تھک چکا ہوں مجھے تازہ دم کیا جائے
(قمر رضا شہزاد)

ماں نے چوما ہے جس کے ماتھے کو
عید اُس شخص نے منائی ہے
آؤ سجدے کریں کہ پاکستان
ایک مسجد بنی بنائی ہے
(حسن عباسی)

آخری بس ہے اور نکلنے والی ہے
آ جاؤ اک سیٹ برابر خالی ہے
شہر کی حالت اتنی بھی مخدوش نہیں
دیکھو میں نے آج بھی جان بچا لی ہے
(شوکت فہمی)

ایک دریا ہوں روانی کے لیے آیا ہوں
یعنی میں شعلہ بیانی کے لیے آیا ہوں
تیری محفل سے مجھے کچھ نہیں لینا دینا
میں تو بس یاد دہانی کے لیے آیا ہوں
(فرتاش سیّد)

جو کہہ دیا وہ کر کے دکھانا پڑا مجھے
اس دل لگی میں جان سے جانا پڑا مجھے
جیون میں کوئی اور تھا دل میں تھا کوئی اور
دونوں سے دل کا حال چھپانا پڑا مجھے
(ڈاکٹر صغرا صدف)

کروں میں کیوں بھلا منصوبہ بندی
یہ دل اس بات کا قائل نہیں ہے
سنو بیگم یہ اپنا دسواں بچہ
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے
(فہیم ضیا)

اسپین (بارسلونا) میں مقیم پنجابی کے نامور شاعر
ارشد اعوان کا پہلا پنجابی شعری مجموعہ
"بلھے دا پنجاب"
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے
صفحات: 128 قیمت: 300

ملنے کا پتہ: نستعلیق مطبوعات، لاہور
0300-4489310

میاں چنوں دی گریٹ

گل نوخیز اختر / لاہور

بیس سال پہلے کی بات ہے یہی دن تھے۔ سخت ترین گرمی اور حبس۔ ایک کچی آبادی کے چوبارے پر مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ حسب معمول شعرا پہنچ گئے۔ حلق سوکھے ہوئے تھے اور سب کی ترسی ہوئی نگاہیں ٹھنڈے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ پانی تو موجود تھا لیکن ٹھنڈا نہیں تھا۔ خیال آیا کہ یقیناً مشاعرے کے بعد یہ نعمت ضرور میسر ہوگی۔ کئی ایک نے خوش کن سرگوشی بھی کی کہ مشاعرے کے بعد میٹھے اور ٹھنڈے شربت کا انتظام لگتا ہے۔ اللہ اللہ کر کے مشاعرہ ختم ہوا سب کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اتنے میں نظامت کرنے والے صاحب نے کمال سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ حضرات! اپنی اپنی سیٹوں پر تشریف رکھیں، آپ سب کے لیے گرما گرم چائے کا انتظام کیا گیا ہے۔ مجھے یاد ہے یہ سنتے ہی تین چار شاعر باقاعدہ دھاڑیں مار مار کر ہنسنے لگے تھے۔

اب ایسا نہیں ہوتا، مشاعرے خوبصورت سے خوبصورت ترین ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی تازہ مثال میاں چنوں میں برادرم عامر بن علی اور رانا بابر حسین کی جانب سے منعقدہ عید ملن مشاعرہ ہے۔ عامر بن علی خود کتنے خوبصورت شاعر ہیں اس کا اندازہ ان کی دیگ کے ایک دانے کو چکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

حُسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے؟
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

آج سے شاید چھ سات سال پہلے بھی وہ میاں چنوں میں ایسا ہی عظیم الشان مشاعرہ کروا چکے ہیں۔ اب کی بار تو انہوں نے حد ہی مکا دی۔ جزئیات میں آگے چل کر بتاتا ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنی گاڑی میں ہی میاں چنوں چلا جاؤں لیکن پنجابی کمپلیکس میں جہاں سارے شعرا اکٹھے ہوئے وہاں ابرار ندیم، راجہ نیر اور دیگر پرانے دوستوں کو دیکھ کر رگ پھڑک اُٹھی کہ ان کے بغیر سفر کا مزا نہیں آئے گا۔ سو گاڑی پنجابی کمپلیکس کی پارکنگ میں چھوڑی اور کوسٹر میں اپنے محبت بھرے دوستوں کو جوائن کر لیا۔ لاہور سے میاں چنوں 4 گھنٹے کا راستہ ہے لیکن الحمدللہ بابا نجمی صاحب کی بدولت ہم ساڑھے پانچ گھنٹے میں منزل تک پہنچے۔ بابا جی کو بس رکوانے میں ملکہ حاصل ہے۔ ڈرائیور کے کان میں کچھ کہتے اور وہ بے بسی سے کسی قریبی پٹرول پمپ پر بریک لگانے پر مجبور ہو جاتا۔

میاں چنوں پہنچے تو 'جاپان ہاؤس' کا لان شاعروں سے بھرا ہوا تھا۔ ذرا نام ملاحظہ فرمایئے ظفر اقبال، انور مسعود، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، وصی شاہ، ڈاکٹر صغرا صدف، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، خالد مسعود، اختر شمار، عباس تابش، اقبال راہی، رضی الدین رضی، قمر رضا شہزاد، حسن عباسی، لبنیٰ صفدر، زاہد شمس، رخشندہ نوید، علی رضا، عامر سہیل، تیمور حسن تیمور، غافر شہزاد، فاخرہ انجم، بابا نجمی، سعود عثمانی، سعدیہ صفدر سعدی، شوکت فہمی ابرار ندیم، راجہ نیّر، نیلما ناہید، صوفیہ بیدار، شاہدہ دلاور شاہ، عزیز احمد، ممتاز راشد لاہوری، محسن مگھیانہ، ندیم بھابھہ، نبیل نجم اور سب سے بڑھ کر خود عامر بن علی۔ کئی نام مجھے یاد نہیں رہے براہ کرم انہیں بھی شامل سمجھئے۔ ایک پرتکلف عشائیے کے بعد جب شاعروں کو پنڈال کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو یہ منظر دید کے قابل تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے شاعروں کی اجتماعی شادی ہو رہی ہے۔ مکمل بینڈ باجے اور پھلجھڑیوں کی روشنی میں ڈھول کی تھاپ پر شاعروں کا جلوس شہر کی مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا پنڈال تک پہنچا تو سڑکوں پر لوگوں کی کثیر تعداد جمع ہو چکی تھی۔ سب ڈھونڈ رہے تھے کہ دولہا کون ہے؟ اسی خطرے کے پیش نظر کوئی بھی شاعر فرنٹ پر نہیں رہا اور سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہے۔ اتنی سخت گرمی اور حبس کے باوجود پنڈال یوں بھرا ہوا تھا کہ میں نے ایک جگہ تل دھرنے کی کوشش کی لیکن اس کی بھی جگہ نہ ملی۔ میاں چنوں والوں کی یہ محبت ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ خصوصاً رانا عبداللہ صاحب جس طرح مہمانوں کا خیال رکھ رہے تھے اس نے خود مہمانوں کو شرمندہ کر دیا۔ 72 شاعروں نے کلام پیش کرنا تھا جس میں مقامی شعرا شامل نہیں تھے اور اس تعداد کو دیکھ کر یقین ہو رہا تھا کہ مشاعرہ یقیناً تین چار سال ضرور چلے گا لیکن میاں چنوں کے شعرا کی اعلیٰ ظرفی کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی جنہوں نے اپنے خوبصورت کلام کو سمیٹا اور اعلان کیا کہ وہ صرف مہمان شعرا کو سنیں گے۔ بعد میں ابرار ندیم نے گنتی کر کے بتایا کہ کچھ شعرا کے نہ آنے کے باعث تعداد 72 کی بجائے 56 رہ گئی ہے لیکن یہ تعداد بھی کم نہیں تھی کیونکہ

ہر شاعر نے دو غزلیں سنائی تھیں اور ابھی تو لسٹ بھی طے نہیں ہوئی تھی۔ عامر بن علی خوفزدہ تھے کہ شاعروں کے حفظ مراتب میں کوئی کمی پیش ہو گئی تو انہیں جے آئی ٹی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لیکن ایک حیرت انگیز اور خوشگوار ترین بات یہ ہوئی کہ بغیر کسی ترتیب کے سینئر جونیئر شاعروں کو بلایا جاتا رہا اور کسی نے مائنڈ بھی نہیں کیا۔

10 بجے شروع ہونے والا یہ مشاعرہ صبح تین بجے جاری رہا اور مجال ہے پنڈال میں سے کوئی ایک شخص بھی اٹھ کر گیا ہو۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ کئی لوگوں نے تو ساری رات کھڑے ہو کر یہ مشاعرہ سنا۔ ڈاکٹر صغریٰ صدف نے جب مجھے کلام پیش کرنے کے لیے بلایا تو شرارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اب تشریف لاتی ہیں گل نوخیز اختر۔ میں سمجھ گیا کہ صغریٰ صدف نے میرا بیڑا غرق کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ صغریٰ صدف نے مزید شرارت کی کہ مائیک پر ہی کہہ دیا کہ میں جب تک نوخیز سے نہیں ملی تھی میں اسے عورت سمجھتی رہی ہوں۔ میں نے بھی مائیک میں کہہ دیا کہ میں بھی جب تک صغریٰ صدف سے نہیں ملا تھا میں بھی انہیں عورت ہی سمجھتا رہا ہوں۔ اس کے بعد پنڈال میں اتنی زور کا قہقہہ بلند ہوا کہ صغریٰ صدف نے باقاعدہ میرے کان میں دھمکی دے دی، میں تینوں نئیں چھڈناں!!

یہ مشاعرہ بہت سے لوگوں سے طویل عرصے بعد ملاقات کا ایک بہانہ بھی بن گیا۔ عامر بن علی کی محبت اور پیار کے سبھی قائل ہیں۔ عامر دوستوں کا دوست تو ہے ہی، یہ دشمنوں سے بھی دوستی کا خواہاں ہے۔ میں نے آج تک اسے کسی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعرے میں وہ لوگ بھی اکٹھے بیٹھے نظر آئے جو عام طور پر ایک دوسرے کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ظفر اقبال صاحب جو عموماً مشاعروں میں جاتے نہیں اور جائیں تو آخر تک نہیں بیٹھ سکتے۔ وہ بھی اس مشاعرے میں اختتام تک موجود رہے۔ سچی بات ہے شاعروں کا اتنا بڑا اجتماع کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، لیکن عامر بن علی کو مشکل کام کرنے کا شوق ہے۔ لہٰذا انہوں نے یہ دریا بھی پار کر کے دکھا ہی دیا اور اس کے بعد ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اب یہ مشاعرہ ہر سال ہوا کرے گا۔ یقیناً ایسی محفلیں ہر سال ہوں گی تو کئی نفرتیں بھی محبتوں میں بدل جائیں گی۔ میاں چنوں کا یہ مشاعرہ برسوں یاد رہے گا اور یہ بھی یاد رہے گا کہ جب ہم صبح سات بجے کی بجائے ساڑھے نو بجے لاہور پہنچے تو بابا نجمی ایک بار پھر ڈرائیور کے کان میں کوئی سرگوشی کر رہے تھے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

میاں چنوں کا عید ملن مشاعرہ

لبنیٰ صفدر/ لاہور

بدلتے ہوئے حالات نے گو انسانی زندگی کو مصروف ترین بنا دیا ہے۔ روزگار کے چکروں میں وہ اپنے ذاتی کئی شوق، کئی خواب پورے کرنے سے محروم رہ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اپنے کام سے محبت اور لگاؤ رکھنے والے زندگی کی اس تیز رفتار دوڑ دھوپ میں سے فراغت کے لمحے تلاش کر کے اپنے شوق کی تکمیل کر ہی لیتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبہ جات کے علاوہ میں خاص طور پر فنونِ ادب سے تعلق رکھنے والوں کا ذکر کرنا چاہوں گی۔ آج جب نئی نسل کا کتاب سے رشتہ تقریباً منقطع ہو چکا ہے۔ پھر بھی نئی اور پرانی نسل کا ملا جلا کاروانِ ادب ہر چیز سے بے نیاز اپنی راہوں پر رواں دواں نظر آتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جدید دور میں مشاعروں کی روایت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سچ ہو گا لیکن مکمل سچ نہیں ہے۔ لاہور کی کچھ قدیم تہذیبی روایات کے ساتھ ساتھ یہ روایت بھی ابھی تک قائم ہے۔ ہر روز جگہ جگہ ادبی بیٹھکیں سجائی جاتی ہیں۔ راہ نوردِ شوق بہترین کلامِ سخن پیش کر کے داد و تحسین وصول کرتے ہیں۔ اگرچہ لاہور ادب کا مرکز رہا ہے اور ہر وہ شخص جو ادب کے کسی بھی میدان سے تعلق رکھتا ہے اپنے شوق کی تسکین کے لیے یہاں کا رُخ کرتا ہے۔

اس کے ساتھ دوسرے شہروں کا مقابلہ کیا جائے تو وہاں ایسی تقریبات کی مثالیں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن کچھ عرصہ سے میاں چنوں جیسے مضافاتی علاقہ میں بہت بڑے پیمانہ پر بہت معیاری پروگرام جس میں ملک کے نامور شاعر و ادیب شرکت فرماتے ہیں۔ دیکھنے کو ملا۔

عامر بن علی کے نام سے کون واقف نہ ہو گا۔ جو شاعری، سفرنامہ اور صنف ادب کے تمام شعبہ جات میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ میاں چنوں سے تعلق ہے۔ خود جاپان میں بسلسلہ روزگار رہائش پذیر ہیں لیکن اپنے آبائی شہر سے انتہائی مضبوط رشتہ بنائے رکھا۔

سال رواں کے مہینہ جون میں انہی کی رہائش گاہ پر منعقد مذکورہ مشاعرہ میں راقمہ کو بھی شرکت کا موقع ملا۔ لاہور سے شرکت کرنے والے شعرا کے لیے لاہور ہی میں ظہرانہ کا انتظام کیا گیا اور میاں چنوں تک سفر کے لیے بس بھی فراہم کی گئی۔

میں، حسن عباسی اور علی رضا ذاتی گاڑی میں لاہور سے میاں چنوں کے سفر میں شریک رہے۔ مشاعرہ میں شرکت سے قبل یہ بھی ایک یادگار سفر رہا۔ میاں چنوں جانے کا مجھے پہلی بار اتفاق ہوا۔ سفر گو کہ طویل تھا لیکن خوش گپیوں میں سفر کے کٹنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ ہلکا پھلکا ہنسی مذاق اور چٹکلے چل رہے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ گاڑی روک کر سڑک کے کنارے کچے ٹیلوں کے پاس تو کبھی ہرے بھرے درختوں کے سامنے ہم سب نے اس یادگار سفر کی یادوں کو اپنے کیمروں میں محفوظ کر لیا۔ حسن عباسی کی دوسری بہت سی خوبیوں کے ساتھ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ عام سی جگہ میں بھی کوئی خاص منظر تلاش کر ہی لیتے ہیں اور تصویر کشی کے لیے ایسی ایسی جگہیں تلاش کر لیتے ہیں کہ عام مناظر بھی خاص لگنے لگتے ہیں۔ علی رضا صاحب نے مخصوص انداز میں گا کر بہت خوبصورت اشعار سنائے۔ نہ صرف اشعار سنائے بلکہ اپنے شہر ساہیوال کی خاص مٹھائی سے راستے میں ہماری تواضع کی۔ جس طرح مشاعرہ ناقابل فراموش ہے اسی طرح اس مشاعرہ سے جڑا یہ سفر بھی ہمیشہ یاد رہنے والا ہے۔

اس مشاعرہ کے میزبانوں کی مہمان نوازی سے لے کر پروگرام کے حوالے سے کیے گئے پورے طور پر مکمل اور بہترین انتظامات نے شرکت کرنے والے تمام مہمانوں کے دل خوشی سے نہال کر دیے۔

مشاعرہ سے قبل عامر بن علی صاحب اور ان کے بھائی رانا بابر (جو وہاں کے ایم پی اے) بھی ہیں، نے اپنے گھر میں ایک پرتکلف ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وسیع و عریض ہرے بھرے دالان میں خوبصورت نشستوں کا انتظام تھا۔ جہاں پر پہلے تمام مہمانوں کی تواضع پہلے کولڈ ڈرنکس اور پھر چائے اور اُس کے ساتھ دیگر لوازمات سے کی گئی۔ سب ادیب و شاعر اپنے چہروں پر اطمینان بھری مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ملک کے تمام نامور شعرا کو ایک جگہ اکٹھے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ساتھ ہی نسل نو کے اُبھرتے ہوئے شعرا کو یہاں پر دعوت دی گئی تھی۔ چائے کا دور ختم ہوا تو کچھ دیر کے بعد پرتکلف ضیافت کا دور آغاز ہوا۔ ان گنت خوشبودار اور خوش ذائقہ پکوان اپنے مہمانوں کی اشتہا

کو بڑھا رہے تھے۔ ہر ڈش اپنی جگہ پر مکمل اور خوش ذائقہ یعنی اس بات کا اندازہ لگانا نہایت مشکل تھا کہ ان میں سے کون سی زیادہ بہترین ہے۔ اس شاندار اہتمام کے بعد مہمانوں کو ان کی آرام دہ نشستوں پر پان اور پھر سبز چائے پیش کی گئی۔ ساتھ ہی کچھ ہی فاصلے پر واقع مشاعرہ کے لیے سجائی گئی انتہائی وسیع و عریض عمارت میں جانے کی تیاری شروع ہوگئی۔

یہاں پہنچنے پر مزید خوشگوار حیرتیں ہماری منتظر تھیں۔ گیٹ پر بینڈ باجے اور ڈھول سے مہمانوں کا استقبال کیا گیا۔ گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو راہداری کے دونوں اطراف میں کھڑے ڈیوٹی پر مامور کئی لوگوں نے شعرا پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ شاید میاں چنوں کے تمام پھولوں کو اس دن شعرا پر نچھاور کر دیا گیا تھا۔

اب مزید آگے کا حال بھی عجیب تھا اور کیا ہی خوبصورت منظر تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں منظم انداز میں بیٹھے ہوئے سامعین موجود تھے۔ ہزاروں نشستوں کے اہتمام کے باوجود بے شمار لوگ اردگرد کھڑے ہوئے تھے لیکن مجال ہے کہ کسی ایک شخص نے بھی بے ہودگی یا اپنے غیر مہذب ہونے کا ثبوت دیا ہو۔

ہزاروں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ تھوڑا آگے بڑھے تو سٹیج کے قریب پہنچتے ہی نظامت کرنے والا بھرپور تعارف کے ساتھ شاعر کا نام پکارتا اور ساتھ ہی بیٹھے میوزیشن خوبصورت دُھن کیساتھ اپنے معزز مہمان کو سٹیج پر آنے کی دعوت دیتے۔ دل باغ باغ ہو گیا۔

اس انتہائی خوبصورت پروگرام کی انتہائی خوبصورتی یہ تھی کہ ہر شاعر مہمان خصوصی تھا۔ ہر شاعر کے لیے سٹیج پر جگہ دی گئی تھی۔ بیسویں شعرا کا مہمان خصوصی کا سا مقام دینا اور ان کے لیے اتنا بڑا وسیع اسٹیج سجانا اپنی جگہ ایک منفرد مثال تھا۔ گرمی اگرچہ عروج پر تھی لیکن روم کولرز اور پنکھوں کا اتنا مکمل انتظام تھا کہ گرمی کا شائبہ تک نہ ہو رہا تھا۔

ایک اور عجز و انکسار یا مہمان نوازی کی اعلیٰ مثال یہ تھی کہ میزبان خود سٹیج سے نیچے سامعین کے ساتھ براجمان تھے۔ مختصراً یہ کہ ہر شاعر اُس دن VIP تھا اور میزبانوں کی مکمل کوشش تھی کہ زندگی کی ہر خوبصورتی ان مہمانوں کے لیے یہاں پر اکٹھی کر دی جائے۔

گھر میں کی گئی مہمان نوازی سے لے کر مشاعرہ کے سٹیج تک مہمانوں کی خدمت کے لیے اپنے لوگ مامور تھے کہ مجھے شک گزرا کہ شاید ایک ایک مہمان کے لیے کئی کئی خدمت گاروں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایک گلاس پانی مانگا تو چار چار لوگ حرکت میں آ گئے۔

بلاشبہ ماحول اور انتظامات نے مغلیہ دور میں ہونے والے پرتکلف مشاعروں کی یاد کو تازہ کر دیا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک مدت تک اس مشاعرہ کی یادیں ذہنوں میں تازہ رہیں گی لیکن عامر بن علی نے یہ اعلان کر کے کہ یہ مشاعرہ ہر سال منعقد کیا جائے گا میرے اس خیال کو ختم کر دیا کہ اس مشاعرہ کو مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ یقیناً ہر نیا مشاعرہ پہلے سے بڑھ کر اپنی خوبصورت یادوں کے نقوش دلوں پر ثبت کرے گا۔ ہم سب عامر بن علی اور ان کے احباب کی ادب سے اتنی گہری محبت اور اس خوبصورت روایت کو قائم رکھنے کی کوششوں کی پائیداری اور ہمیشگی کے لیے دعا گو ہیں۔

شاعری/ظفر اعوان (کوپن ہیگن/ڈنمارک)

وطنیں واپس مڑ جاواں گا
لیکھ میرے جے سوئے ناں
آکھیں میری ماں نوں بیبا
ہجر میرے وچ روئے ناں
چُندی روے صبر دے موتی
ہنجو ہار پروئے ناں
خوشیاں اندر غم سمندر
درد کنارے توئے ناں
کردی روے دُعا دلے توں
بھار دُکھاں دا ڈھوئے ناں
ماپے چھڈ پر دیسیں وے
پُت میرے جیا ہوئے ناں
ربا اوہدا صبر ناں مٹے
اکھ دا پانی چوئے ناں
ظفر جھلہ مر جائے گا
ماں تینوں کجھ ہوئے ناں

....

توں ایں ساڈا یار وے بیبا
توں تے سٹ ناں مار وے بیبا
جیہڑا پانیاں کولوں ڈردا
کیہ لنگناں اُس پار وے بیبا
منزل تے اکھ رکھن والے
کدے ناں مندے ہار وے بیبا
جے کوئی وڈا دُکھ ناں ہوئے
جیون دے دن چار وے بیبا
جس تھاں بابل بیٹھک پائی
پُتراں پائی دیوار وے بیبا
ناں مَیں ڈُبدا ناں مَیں تردا
پھسیا ادھ وچکار وے بیبا
ظفر نل جے اکھ ملائیں
دل دے کھڑکن تار وے بیبا

میاں چنوں کا یادگار عالمی مشاعرہ

عامر بن علی/میاں چنّوں

مشاعرہ برصغیر پاک و ہند کی ادبی اور ثقافتی روایت کا ایک خوبصورت پہلو ہے۔ شاعری تو ہزاروں سال سے دنیا کے ہر کونے میں ہوتی آرہی ہے مگر ہماری شاعری کا اہم امتیاز جو اسے ''پرفارمنگ آرٹ'' بناتا ہے وہ مشاعرہ ہے۔ تین صدیوں پر محیط مغلیہ دور کے ہماری سرزمین پر یوں تو بے شمار اثرات نظر آتے ہیں مگر فنِ تعمیر، اردو زبان اور مشاعرے کی روایت ایسی خوبصورت چیزیں ہیں جن سے مغلوں کے بدترین نقاد بھی انکار نہیں کرسکتے۔ مغل بادشاہ اور ان کے دربار سے منسلک لوگ خود بھی شعر کہتے اور محفلِ مشاعرہ کا باقاعدگی سے اہتمام کرتے۔ مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد بھی ان کی چہیتی اردو زبان اور مشاعرے کی روایت پاکستان میں آج بھی اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ قائم اور دائم ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں منعقدہ مشاعروں کا احوال تو آپ پڑھتے ہی رہتے ہیں، مگر پاکستان میں ایک چھوٹا سا شہر ایسا بھی ہے جہاں مشاعرے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ میری مراد میاں چنوں سے ہے۔ اہلِ ذوق میاں چنوں کو پنجاب کا لکھنؤ بھی کہتے ہیں۔ جنوبی پنجاب کی ملتان ڈویژن میں واقع اس تحصیل میں شعر اور مشاعرے کی روایت بہت توانا ہے۔

مشاعرے کی اسی درخشندہ روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے بلدیہ میاں چنوں نے ادبی وسماجی تنظیم راوی فاؤنڈیشن کے تعاون سے ایک عظیم الشان عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا۔

اگر کیلنڈر پر نظر دوڑائیں تو گزشتہ چند برسوں میں ایسا اعلیٰ پائے کا مشاعرہ شاید پاکستان میں اور کہیں بھی نہیں ہوا۔ یہ مبالغہ آرائی نہیں ہے، مہمان شعراء کرام کے نام دیکھیں تو آپ کو خود ہی یقین ہو جائے گا۔ مشاعرے کی صدارت ہمارے عہد کے عظیم شاعر ظفر اقبال نے کی۔ محفلِ مشاعرہ کے مہمانانِ خصوصی انور مسعود، عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض وصی شاہ اور ڈاکٹر صغریٰ صدف نے انجام دیئے۔ مہمان اعزاز پارلیمانی سیکرٹری برائے خزانہ رانا بابر حسین ایم پی اے تھے۔ منوّ بھائی نے اس محفل میں شریک ہونے کا وعدہ کیا تھا اور ان کا ارادہ بھی یہی تھا مگر شدید علالت کے باعث وہ ہسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں تھے، پھر بھی انہوں نے ہمارے دوست شوکت فہمی کو بتایا کہ میاں چنوں مشاعرے میں ضرور جانا ہے۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا۔

مشاعرے کے منتظمین کا خیال تھا، جن میں چیئرمین بلدیہ چوہدری ندیم اختر ایڈوکیٹ کے علاوہ راقم الحروف بھی شامل تھا کہ مقامی شعراء کرام کو بھی مشاعرہ پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ حسنِ اتفاق سے میاں چنوں کی سرزمین شعر و ادب کے حوالے سے اس قدر زرخیز ہے کہ مقامی شعراء کرام کی تعداد پچیس تک پہنچ گئی۔ لہٰذا تمام شعراء کرام نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ مہمان شعراء کے اعزاز و اکرام میں کوئی بھی مقامی شاعر مشاعرہ نہیں پڑھے گا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ چھ گھنٹے طویل اس پروگرام میں تمام مقامی شعراء آخر تک اپنی نشستوں پر نہ صرف براجمان رہے بلکہ داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے رہے۔ ہزاروں کی تعداد میں سبزہ زار بلدیہ میں کرسیاں لگائی گئی تھیں مگر پھر کثیر تعداد میں لوگ مشاعرے کے اختتام تک کھڑے رہے چونکہ انہیں بیٹھنے کے لیے نشست دستیاب نہ ہو سکی تھی۔ یہ تعداد ان لوگوں کے علاوہ تھی جو اپنے گھروں میں بیٹھ کر کیبل ٹی وی پر مشاعرہ براہ راست دیکھ رہے تھے۔ دنیا بھر میں فیس بک پر یہ پروگرام لائیو دیکھنے والوں کی تعداد ہزاروں میں تھی، ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔

مشاعرے سے قبل راقم کی رہائش گاہ پر عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا، اس کے بعد تمام شعراء کرام جلوس کی شکل میں مشاعرہ گاہ روانہ ہوئے۔ ڈھول، تاشوں اور میوزک بینڈ کے علاوہ آتش بازی کا مظاہرہ کیا گیا۔ تمام شہر اور بالخصوص بلدیہ کی عمارت کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ جیسے ہی شعراء کرام سبزہ زار بلدیہ میں داخل ہوئے ان کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور گل پاشی کی گئی۔

مشاعرے کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے کیا گیا جس کے بعد پاکستان کے نامور نعت خواں شاعر علی رضا نے ہدیہ نعت پیش کیا۔ خطبہ استقبالیہ چیئرمین بلدیہ چوہدری ندیم اختر ایڈوکیٹ نے پیش کیا

،شرکاء کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ شہر کے لیے ترقیاتی منصوبوں کے متعلق اپنا لائحہ عمل پیش کیا۔ اس کے بعد مشاعرے کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اور مظہر بخاری نے نظامت کے لیے ڈاکٹر صغرا صدف کو مدعو کیا۔ خوبصورت لب و لہجے کے شاعر ابرار ندیم نے سب سے پہلے اپنا پنجابی کلام پیش کیا۔ ان کے بعد مقبول رومانوی شاعر حسن عباسی نے سامعین سے داد سمیٹی۔ نبیل نجم کے بعد معروف مزاحیہ شاعر خالد مسعود خاں نے اپنی ناسازی طبع کے باعث جلدی پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا، وہ طبیعت خراب ہونے کے باوجود بڑی محبت سے ملتان سے تشریف لائے تھے۔ ان کے بعد قمر رضا شہزاد اور رضی الدین رضی نے اپنا کلام پیش کیا اور بھرپور داد پائی۔ فاخرہ انجم کی شاعری کو سامعین نے بہت پسند کیا اور ان کو مشاعرے کے لیے شادی بیاہ جیسا ماحول بہت پسند آیا۔ بسمل صابری نے اپنی معروف غزل پیش کی وہ اشک بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے، عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے۔ تازہ کار شاعر ندیم بھابھہ کے گھر میں کچھ اہم نجی مصروفیت تھی مگر پھر بھی وہ ملاقات کے لیے خصوصی طور پر میلسی سے تشریف لائے۔

قطر سے آنے والے معروف شاعر فرتاش سید جب غزل سنا کر جانے لگے تو لوگوں نے شور اٹھا دیا کہ اور پڑھا جائے اور اگلی غزل پر بھی انہیں پہلی سے بڑھ کر داد ملی۔ منفرد لب و لہجے کی شاعرہ لبنیٰ صفدر نے بھرپور داد سمیٹی۔ گزشتہ دنوں ٹریفک حادثے کا شکار ہونے والی مقبول شاعرہ صحت یابی کے بعد تشریف لائیں تو طاہرہ سرا کا لوگوں نے بھرپور استقبال کیا، ان کی چھوٹی بہن سعدیہ صفدر سعدی بھی بڑی توانا شاعرہ ہیں وہ بھی مشاعرے میں تشریف لائیں اور خوب داد سمیٹ کر گئیں۔ فیصل آباد سے علی زریون نے اپنے مخصوص انداز میں شاعری سنائی تو لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ مسقط عمان میں تدریس کے شعبے سے وابستہ شاعر فہیم ضیاء بھی خصوصی طور پر اس محفل میں شریک ہوئے۔ ناروے سے جواد شیخ اور آفتاب وڑائچ اس عالمی مشاعرے کی زینت بنے اور فرانس سے تشریف لائے ہوئے شاعر ایاز محمود ایاز بھی شریکِ محفل تھے۔ بیرونِ ملک سے آنے والے شعراء نے محفل کو اور بھی خوبصورت بنا دیا۔ ہندوستان سے علینا عترت اور اظہر عنایتی کو مدعو کیا گیا تھا مگر ان کو پاکستان کا ویزہ باوجود کوشش نہیں مل سکا۔

بصارت سے محروم شاعر تیمور حسن تیمور نے اپنی غزل سنائی تو محفل کا رنگ دیدنی تھا۔ گلِ نوخیز اختر اور ڈاکٹر صغرا صدف کی نوک جھونک کو سامعین نے بہت پسند کیا۔ صوفیہ بیدار اور ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ بھی شریکِ محفل تھیں۔ نیلما ناہید درانی سے فرمائش کی گئی جس پر انہوں نے غزل سنائی۔

اداس لوگوں سے پیار کرنا کوئی تو سیکھے
سفید لمحوں میں رنگ بھرنا کوئی تو سیکھے

راجا نیر، عافر شہزاد اور سعود عثمانی نے بھی اپنا کلام پیش کیا اور خوب داد سمیٹی۔ کراچی کی نمائندگی زیب النساء زیبی نے کی۔ عباس تابش کو بے حد پسند کیا گیا۔ حکیم ارشد شہزاد اور بابا نجمی نے اپنا پنجابی کلام پیش کیا۔ اختر شمار کو بہت زیادہ سراہا گیا۔ اقبال راہی، شکیل راؤ، عزیر احمد، زاہد شمس اور سہیل عابدی نے بھی اپنی شاعری سامعین کی سماعتوں کی نذر کی۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے اپنے مزاحیہ کلام سے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیا۔ خالد شریف نے جب یہ غزل پیش کی تو محفل کا رنگ دیدنی تھا "بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی، اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا۔ عطاء الحق قاسمی مشاعروں میں شرکت سے ان دنوں پرہیز کرتے ہیں مگر اس محفل میں خصوصی شرکت کے لیے تشریف لائے اور سامعین سے خوب داد سمیٹی۔ امجد اسلام امجد نے جب اپنا کلام پیش کیا تو رات کا آخری پہر تھا مگر مشاعرہ گاہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور محفل گویا پورے جوبن پر تھی۔ انور مسعود نے مزاحیہ کے ساتھ ساتھ اپنا سنجیدہ کلام بھی پیش کیا جس پر انہیں ان کے معروف مزاحیہ کلام کے برابر داد ملی۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا جب ظفر اقبال نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر یوں گمان ہوتا تھا کہ جیسے ابھی تو محفل جوان ہے۔ مشاعرے کے اختتام پر بھی اتنا زیادہ رش تھا کہ مہمانوں کو نکلتے نکلتے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ فجر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں جب مہمان شعراء اور سامعین اس یادگار عالمی مشاعرے کے بعد میاں چنوں سے رخصت ہو رہے تھے۔

❀❀❀

ثمینہ سیّد/لاہور

ایسے لگتا تھا کہ دنیا ہی اُجڑ جائے گی
خوف تھا چاروں طرف اور ہوا کچھ بھی نہیں

جائے پیدائش پاکپتن پنجاب یونیورسٹی سے ہسٹری میں ایم اے کیا۔ اردو میں ایم اے کیا اردو میں ہی ایم فل کیا۔ افسانہ کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''ردائے محبت''، ''کہانی سفر میں ہے''۔ شاعری کی کتاب ''ہاتھ میرے خالی ہیں'' زیر طبع ہے۔ گورنمنٹ ملازمت ہے گرلز کالج میں بطور اردو لیکچرار۔

اس ریاضت کا مری جان صلہ کچھ بھی نہیں
عشق کا کھیل شراروں کے سوا کچھ بھی نہیں
میں تو چپ ہوں کہ مرے خون میں ہے صبر کی لو
''تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں''
ضبط کے کون سے زینے پہ میں آ پہنچی ہوں
ہاتھ اُٹھے ہیں مگر حرفِ دعا کچھ بھی نہیں
اب تو خورشید بکف ہم کو ابھرنا ہوگا
ان اندھیروں میں فقط ایک دیا کچھ بھی نہیں
ایسے لگتا تھا کہ دنیا ہی اجڑ جائے گی
خوف تھا چاروں طرف اور ہوا کچھ بھی نہیں
خامشی خود ہے تکلم کا وسیلہ سیّد
دشتِ حیرت ہے یہاں صوت وصدا کچھ بھی نہیں

محبت اور خوشبو کا نگر تقسیم ہو جائے
کہیں ایسا نہ ہو گھر کا شجر تقسیم ہو جائے
لہو روتی ہوئی آنکھیں لہو رہتی ہی رہتی ہیں
ہوس کے ہاتھ جب پرکھوں کا گھر تقسیم ہو جائے
کبھی بھی آگ کی فصلیں یہاں پر اُگ نہیں سکتیں
محبت سارے عالم میں اگر تقسیم ہو جائے
اُداسی کے گھنے جنگل میں رستے جا نکلتے ہیں
فضاؤں میں نیا جب ایک ڈر تقسیم ہو جائے
کبھی جو یاد کرتی ہوں تری قربت کے لمحوں کو
مری سانسوں تلک اس کا اثر تقسیم ہو جائے

مری ماں کی دعاؤں کا ثمینہ معجزہ دیکھو
مرے پیروں میں آتے ہی بھنور تقسیم ہو جائے

ذرا بارش برستی ہے شگوفے جاگ اُٹھتے ہیں
کئی رنگوں کی خوشبو سے دریچے جاگ اُٹھتے ہیں
ابھی تک پاؤں کی آہٹ سے یہ مٹی شناسا ہے
تمہارے ساتھ چلتی ہوں دریچے جاگ اُٹھتے ہیں
کچھ ایسے روشنی دل میں اترتی ہے قرینے سے
بہت امکاں ترے وعدوں کے صدقے جاگ اُٹھتے ہیں
گئے وقتوں میں جو سارے ترے ماتھے کی رونق تھے
مری سوچوں میں وہ اب بھی ستارے جاگ اُٹھتے ہیں
کبھی ایسے بھی ہوتا ہے یونہی بیٹھے بٹھائے ہی
مری آنکھوں سے دریاؤں کے دھارے جاگ اُٹھتے ہیں
ثمینہ میں تو لفظوں کو فقط لکھتی ہوں کاغذ پر
تو پھر مصرعوں میں یہ کیسے شرارے جاگ اُٹھتے ہیں

دل دشت کی صورت تھا سمندر ہوا کیسے
سرسبز خزاں زاد مقدر ہوا کیسے
چھاؤں میں ڈھلا کیسے تمازت بھرا موسم
پھولوں سے بھی نازک میرا پیکر ہوا کیسے
پھرتی تھی تمناؤں بھری شال لپیٹے
پھر جذبہ گمنام اُجاگر ہوا کیسے
مدت سے یہ اُلجھی ہوئی گتھی نہیں سلجھی
وہ مجھ میں سمایا تھا تو بے گھر ہوا کیسے

اک راز جو ہم راز رہا برسوں ثمینہ
اب سوچتی ہوں فاش جہاں پر ہوا کیسے

مختلف حیلوں سے ہر طرح ستایا گیا ہے
مجھ کو ہر دور میں ہر بار رُلایا گیا ہے
میرے سینے میں یہ کیا شہر بسایا گیا ہے؟
پھر کہیں جا کے بنی شکل مرے ہونے کی
پہلے خوشبو میں میرا خواب ملایا گیا ہے
جھیل کے نیلگوں پانی نے گواہی دی ہے
آسماں کتنے ستاروں سے سجایا گیا ہے
اپنے لوگوں کو ہی شعلوں کے حوالے کر کے
فتح کا جشن یہاں ایسے منایا گیا ہے
کاٹ کر میری دلیلوں کو ثمینہ سید
فیصلہ کیسا یہ میرے حق میں سنایا گیا ہے

قحط سالی سی قحط سالی ہے
دل تیری یاد سے جو خالی ہے
دیکھ لے آسماں کے بستر پر
چاند میری طرح سوالی ہے
خواب دیکھوں تو کس طرح دیکھوں
نیند اس نے میری چرا لی ہے
شام ہوتے ہی میری آنکھوں میں
تیری یادوں کی سرخ لالی ہے
ہم نے بجھتے ہوئے دیے کی لو
تیز آندھی میں پھر اچھالی ہے

بہنام احمد/اٹلی

میں لے رہا ہوں سہولت سڑک بدلنے کی
کہ میرا خود پہ بھروسہ ہے کارواں پہ نہیں

میں جانتا ہوں ترے جسم کو ہرا کرنا
سو میری آنکھ کی دستک پہ دل کشا کرنا
تمہارے پاس بھی کرنے کو کوئی بات نہیں
تمہیں تو آتا تھا ہر بات پر گلا کرنا
اسے یقین دلانا کہ میں تمہارا ہوں
اور اس فریب میں خود کو بھی مبتلا کرنا
وہاں بھٹکتی ہوئی آتمائیں رہتی ہیں
بدیس جاتے ہوئے مجھ سے رابطہ کرنا
میں اپنے کام سے عزت کما کے آتا ہوں
تم اتنی دیر تلک خیر کی دعا کرنا

مجھے بھی علم نہیں تھا میں شعر کہتا تھا
تمہیں یہ کس نے بتایا میں شعر کہتا تھا؟
یہ پھول، پیڑ، پرندے، دیے شہادت دیں
تو پھر یقین کروں گا میں شعر کہتا تھا
تو کیا وہ سارے صحیفے مجھی پہ اُترے تھے؟
وہ میری نظمیں تھیں، آیا میں شعر کہتا تھا؟
بہت پرانی سی اک ڈائری جو ہاتھ لگی
میں دنگ رہ گیا، گویا میں شعر کہتا تھا
ہنسی اُڑاتے رہے یار ذکر ہونے پر
بنا ہوا ہوں تماشا، میں شعر کہتا تھا
ہرے حروف بہت مہربان تھے مجھ پر
سنو گے میرا فسانہ! میں شعر کہتا تھا
ضیائے حرف تمنا سے یہ کھلا مجھ پر
ترے سبب تھا اُجالا، میں شعر کہتا تھا

زمیں ٹھنڈی ہے، سورج جل رہا ہے
ابھی تک سب مناسب چل رہا ہے
یہ ناؤ ڈوب جائے گی کسی دن
یہ دکھ دریا کے اندر پل رہا ہے
وہ پتھر سے بیاہی جائے گی کل
پروہت اس کو ہلدی مل رہا ہے
یقیناً وہ مجھے پہچان لے گا
کبھی میرے لیے پاگل رہا ہے
بہت پہلے یہ سب ویراں تھا احمدؔ
سمندر بھی کبھی جنگل رہا ہے

ہم پہ اُترا ہوا عذاب سمجھ
زندگی کو زمیں کا خواب سمجھ
پیڑ پودوں کی آب یاری کر
اور اس کام کا ثواب، سمجھ!
اور تھوڑا سا پاس آ کر دیکھ
دیکھ! دریا کا اضطراب سمجھ
میرے کمرے کو آسماں گردان
اپنی تصویر، ماہ تاب سمجھ
ویسے پانی ہی پی رہا ہوں میں
دوستا! تو اسے شراب سمجھ
وقت کی بات مان لے بہنامؔ
چند لمحوں کو بے حساب سمجھ

مرے خمیر کی مٹی تو آسماں پہ نہیں
یہاں بساؤ نئے شہر کہکشاں پہ نہیں
کوئی بتائے مجھے کیا پسند ہے اس کو
کہاں کہاں مجھے ہونا ہے اور کہاں پہ نہیں
میں لے رہا ہوں سہولت سڑک بدلنے کی
کہ میرا خود پہ بھروسہ ہے کارواں پہ نہیں
خیال کرنا مجھے بے سبب نہ کھو دینا
خیال کرنا کوئی دوسرا یہاں پہ نہیں
کہاں پڑے گا کوئی فرق گھر بدلنے سے
مرے حواس پہ چھایا ہے وہ مکاں پہ نہیں
یہ تم سے کس نے کہا ہے میں جھوٹ بولتا ہوں
لو! دیکھ لو کوئی چھالا مری زباں پہ نہیں
ہم آپ اپنی تباہی کے ذمہ دار ہیں دوست
کوئی گلہ بھی ہمیں اپنے رفتگاں پہ نہیں

باغ میں تو اگر نہیں آتا
اس برس بھی ثمر نہیں آتا
میں تجھے صاف دیکھ سکتا ہوں
میں تجھے کیوں نظر نہیں آتا
میرے ہاتھوں میں صرف رستہ ہے
ان لکیروں میں گھر نہیں آتا
دوست! آرام سے رہو، کوئی
اجنبی شخص اِدھر نہیں آتا
روشنی، بارہا نہیں ملتی
وقت بار، دگر نہیں آتا
ایسا کیا بھید ہے کہانی میں؟
کیوں؟ کوئی لوٹ کر نہیں آتا؟

قمر چودھری / سعودی عرب

رکھتا نہ کبھی مجھ کو یوں مہمان بنا کر
صحرا پہ اگر قیس کے احساں نہیں ہوتے

ہم خانہ بدوشوں کے جو ساماں نہیں ہوتے
سو گھر بھی ہمارے کبھی ویراں نہیں ہوتے
رکھتا نہ کبھی مجھ کو یوں مہمان بنا کر
صحرا پہ اگر قیس کے احساں نہیں ہوتے
ممکن ہی نہیں تھا کہ کنارے سے میں ملتا
جو ناؤ کے چوگرد یہ طوفاں نہیں ہوتے
کھاتے ہیں قسم سانس کبھی لیتے نہ جاناں
ہم کو جو ترے آنے کے امکاں نہیں ہوتے
ہم لوگ قمر غیر کے آگے نہیں جھکتے
ہم لوگ زمانے میں پریشاں نہیں ہوتے

اس عالمِ وحشت میں سہارا نہیں کوئی
سب تیرے طرف دار ہمارا نہیں کوئی
سب نے ہی کریدا ہے مرے زخم جگر کو
اب مجھ کو سہارا بھی گوارا نہیں کوئی
ہر در پہ پکارا کہ یہاں کوئی تو ہوگا
ہر در سے صدا آئی تمہارا نہیں کوئی
مجھ کو ہے خبر ڈوب کے رہنا ہے بھنور میں
کشتی کو مری ملنا کنارا نہیں کوئی
پھر کس نے یہ پیچھے سے ہمیں مارا ہے خنجر
گر شہر میں دشمن بھی ہمارا نہیں کوئی
اس یار جفا جو نے قمر مجھ سے کہا ہے
دنیا میں اسے مجھ سے تو پیارا نہیں کوئی

گر زمیں سے یہ آسماں تک ہے
تو محبت یہ دو جہاں تک ہے
تیری دنیا بھی تو وہاں تک ہے
میری آنکھوں میں تو جہاں تک ہے
تیر کھینچا تو جان جائے گی
دور مجھ سے تو بس کماں تک ہے
اُڑ گیا تو نہ ہاتھ آؤں گا
خوف مجھ کو تو اس جہاں تک ہے
دل جلا ہے یا کچھ جلا دل میں
آگ ہے اور نہ دھواں تک ہے
پیڑ کی چھال ہو یا پھل اس کا
ذائقہ تو فقط زباں تک ہے
میں نہاں کو بھی دیکھتا ہوں قمر
آئنہ تو فقط عیاں تک ہے

جس کو ڈھونڈا سجود کے اندر
اس کو پایا وجود کے اندر
ایک نوحہ فضائے زنداں میں
ایک ماتم وجود کے اندر
ایک طوفان کتنے عرصے سے
اُٹھ رہا ہے وجود کے اندر
عشق بپھرے ہوئے سمندر سا
کب ہے رہتا حدود کے اندر
حُسن رسوا نہ پھر قمر ہوگا
عشق ہو جو حدود کے اندر

دشمنو پاس میرے آؤ تم
دوستوں سے مجھے بچاؤ تم
دوستوں نے یہ کام کر ڈالا
تیر اب مجھ پہ نہ چلاؤ تم
دوستو ساتھ لائے خنجر تو
آستینوں میں نہ چڑھاؤ تم
میری بربادیوں پہ ہنسنے کو
دوستوں کو مرے بلاؤ تم
دوستوں کو مرے جلا ڈالو
دشمنو پیار سے بلاؤ تم
دوستوں نے جو مار ڈالا ہے
لاش میری کو پھر اُٹھاؤ تم
دوستو سر جھکا کے آئے ہو
میری تربت سے دور جاؤ تم

یوں بعد مرے تجھ سے وفا کون کرے گا
پتھر کو زمانے میں خدا کون کرے گا
چھوتے ہوئے چبھتا ہے جو ہاتھوں کو ہمارے
اس خار کو اب گل سے جدا کون کرے گا
محفوظ جو رکھے گی مجھے رنج و الم سے
ماں بعد ترے ایسی دعا کون کرے گا
تعبیر فقط جس کی جدائی ہے تمہاری
اس خواب کو آنکھوں سے جدا کون کرے گا
مایوس جو جاتا ہے ترے در سے قمر تو
پھر سوچ ترے در پہ صدا کون کرے گا

شمشاد شاد/ ناگ پور (انڈیا)

اُستاد: ظفر کلیم، تعلیم: پوسٹ گریجویٹ، پیشہ: ملازمت، تخلیقات: ۶۰۰ سے زائد غزلیں کہہ چکے ہیں مگر اب تک کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہو پایا ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی چھپ کر قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔

حریصانہ طبیعت ہو گئی ہے
عجب انساں کی فطرت ہو گئی ہے
تعصب، بے حسی، تخریب کاری
پریشاں آدمیت ہو گئی ہے
ہے پستی کی طرف مائل مسلماں
مسلط مغربیت ہو گئی ہے
ملوث ہے فسادوں میں قیادت
پراگندہ سیاست ہو گئی ہے
فحاشی اور عریانی دلوں پہ
مروج درحقیقت ہو گئی ہے
ترے بن جی نہیں پاؤں گا جاناں
تو سانسوں کی ضرورت ہو گئی ہے
کہوں کیا شاد فرقت میں تمہاری
بڑی ہی غیر حالت ہو گئی ہے

آئینۂ ہستی کا جوئندہ ہوا سورج
جھانکا جو سمندر میں شرمندہ ہوا سورج
کیا کھیل نرالے ہیں، اس خالق بے چوں کے
میں نیند سے جاگا تو پھر زندہ ہوا سورج
اے چاند ستارو تم کس واسطے جلتے ہو
اللہ کی مرضی سے تابندہ ہوا سورج
اب کے بڑی سختی سے پیش آیا ہے لوگوں سے
کیا دفتر شاہی کا کارندہ ہوا سورج
کیا تھی بھلا مجبوری جو سب سے خفا ہو کر
یوں شہر تمازت کا باشندہ ہوا سورج
اک عمر کے بعد آخر ہونا ہے فنا اس کو
کیوں لوگ سمجھتے ہیں پائندہ ہوا سورج
اے شاد اندھیرے بھی اقرار یہ کرتے ہیں
ہاں مطربِ وحشت کا سازندہ ہوا سورج

معلوم ہی نہیں تھا کہ جھٹلائے جائیں گے
حق بات کی تو دار پہ لٹکائے جائیں گے
جب جب کریں گے چاند کو چھونے کی آرزو
ارمانوں کی فصیل میں چنوائے جائیں گے
جو لوگ چل پڑے ہیں میاں راہِ عشق پر
اپنے ہی آنسوؤں میں وہ نہلائے جائیں گے
اس بار بھی چمن میں نہ آئی بہار تو
پھر زخم دل ہمارے ہی مہکائے جائیں گے
جو امتحانِ عشق میں ناکام ہو گئے
ٹوٹے ہوئے کھلونوں سے بہلائے جائیں گے
دعویٰ خدائی کا جو کریں گے زمین پر
انہرامِ کروفر میں وہ دفنائے جائیں گے
سوچا نہ تھا کہ آئے گا ایسا بھی وقت شاد
غدارِ وقت تخت پہ بٹھائے جائیں

زمانہ تو اسی کا ہے جو تیرا قرب پا جائے
عنایت جس پہ ہو تیری وہ اس دنیا پہ چھا جائے
رخ روشن تمہارا دیکھ کے شرمائے سورج بھی
پری چہرہ ہو تم ایسی جو دیکھے دیکھتا جائے
تری زُلفیں ہیں یا کالی گھٹاؤں کی قطاریں ہیں
بکھر جائیں جو چہرے پر قیامت دل پہ آ جائے
سلونا روپ یہ تیرا ہے ڈھلتی شام کا سایا
کہ جس میں ڈوب کے سورج تپش اپنی بجھا جائے
تمہاری جھیل سی آنکھیں ہیں کچھ جادو بھری ایسی
جواں میں جھانک لے وہ بس انہی میں ڈوبتا جائے
سریلی یہ صدا تیری پرندوں کو رجھاتی ہے
کہ جیسے تیری بولی کا نشہ ان سب پہ چھا جائے
وہ تیرے ہاتھ کا کنگن چڑھاتا ہے میرے دل کو
یہ ناداں چاہتا ہے خود تری بانہوں میں آ جائے
بڑا مشکل سفر اب ہو گیا ہے زندگانی کا
مزہ جینے کا آ جائے جو تو بھی ساتھ آ جائے
سراپا گلستاں تجھ میں ہے نکہت شوخ پھولوں کی
مری دنیا سنور جائے جو تو مجھ میں سما جائے
نشیلی چال ہے تیری یا موجیں ہیں سمندر کی
سفینے بس ادھر جائیں جدھر لے کر ہوا جائے
تراشا جسم یہ تیرا ہے فنکاری مصور کی
سنوارا ہے تجھے کس نے دیوانہ سوچتا جائے
سراپا نور ہے پیکر تیرا، اے جانِ جاناناں
چمک اُٹھے فلک سارا ضیا تجھ سے جو پا جائے
تصور شاد ہے یہ سب، مگر اس لاشعوری میں
کہیں تو ہے کوئی ایسا جو مجھ کو کھینچتا جائے

آصف نیاز/لاہور

پھر وہی بے اختیاری پھر وہی روزِ جزا　　　زندگی ملتی نہیں ہے زندگی کے بعد بھی

آصف نیاز گزشتہ دس برس سے شعروادب سے وابستہ ہیں۔ ادبی محفلوں سے دور تنہائی میں بیٹھ کر شعر کہتے ہیں۔ فطری طور پر شاعری کی صلاحیت ملی ہے۔ غمِ روزگار نے فرصت ہی نہیں دی کہ ادبی تقریبات کا حصہ بنتے۔ سادہ اور آسان زبان میں شعر کہتے ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ ''اب یہاں کوئی نہیں'' کے نام سے زیرِ طبع ہے۔

روشنی ہوتی نہیں ہے روشنی کے بعد بھی
تیرگی ہی تیرگی ہے تیرگی کے بعد بھی
پھر وہی بے اختیاری پھر وہی روزِ جزا
زندگی ملتی نہیں ہے زندگی کے بعد بھی
اس قدر مایوس مجھ کو کر دیا حالات نے
دل فسردہ رہتا ہے میرا خوشی کے بعد بھی
اُس کے آگے سچ کہوں میری انا کوئی نہیں
مجھ کو اچھا لگتا ہے وہ بے رُخی کے بعد بھی
ہے کرم اُن پر خدا کا بے بہا آصف نیاز
مل گئی جس کو ہدایت گمرہی ہے بعد بھی

میں ہوں پیاسا صحرا جیسے
وہ ہے بپھرا دریا جیسے
اندر ایسے خالی خالی
کوئی ویراں کمرہ جیسے
اُس سے رشتہ یوں ٹوٹا ہے
ٹوٹ گیا ہو دھاگا جیسے
اُس کو دیکھ کے یوں لگتا ہے
وہ ہے سچ مچ میرا جیسے
دکھ میں ساتھ وہ یوں ہوتا ہے
دھوپ میں اپنا سایا جیسے

آصف اپنا حال اب یوں ہے
کوئی سوکھا پتہ جیسے

مجھے اس سے محبت ہے
اُسے میری ضرورت ہے
مجھے دکھ دینا چاہو تو
تمھیں پوری اجازت ہے
کسی سے بھی نہیں شکوہ
مجھے خود سے شکایت ہے
مرا کچھ حالِ دل سن لے
کسی کو اتنی فرصت ہے؟
قدم چوموں میں امی کے
کہ ان قدموں میں جنت ہے
مرا دل چوری کرلے وہ
اُسے آصف رعایت ہے

اور کوئی آسرا ہوتا نہیں
پاس میرے کب خدا ہوتا نہیں
اک دعا رہتی ہے روشن راہ میں
دور تک کوئی دیا ہوتا نہیں
اپنا سایا ساتھ چلتا ہے یہاں
دھوپ ہو تو دوسرا ہوتا نہیں

اس سے بچھڑے مدتیں ہونے کو ہیں
ایک پل لیکن جدا ہوتا نہیں
اُس کا میں ہوتا نہیں جو ہے مرا
جس کا میں ہوں وہ مرا ہوتا نہیں
ہوتی ہیں مجبوریاں آصف بہت
ورنہ کوئی بے وفا ہوتا نہیں

ایک انجانی ڈگر ہے اور میں
راہ میں تنہا شجر ہے اور میں
لحہ لحہ ہو رہا ہوں میں بحال
شہرِ جاناں کا سفر ہے اور میں
ہاتھ کٹ جائیں دکھاؤں گر کمال
ہر کوئی یاں بے ہنر ہے اور میں
اس لیے رہتا ہوں اُس کے پاس میں
اُس کے کھو جانے کا ڈر ہے اور میں
مدتوں سے جانتا کوئی نہیں
حالانکہ میرا نگر ہے اور میں
دل مرا لگتا نہیں آصف کہیں
گرچہ یہ میرا ہی گھر ہے اور میں

مدینہ یاد آتا ہے......عقیدت و محبت کا آئینہ

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

''مدینہ یاد آتا ہے'' محمد امین ساجد سعیدی کی نعتیہ شاعری کا پہلا مجموعہ ہے جو حاضری کی دعائے مسلسل لمحہ زیارت کی خوابنا کی، ذکر رسول ﷺ کی کیف پروری اور رحمت اللعالمین ﷺ کے در اقدس سے وابستہ آرزوؤں کی عکاس شاعری ہے۔ جس نے امین رسول ﷺ کے امین شاعر کے عقیدت کی امانت کو لفظوں کے انتخاب میں اسطرح سمو دیا ہے کہ اس قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ صادق و امین نبی ﷺ کے اُمتی نے جذبوں کی صداقت کو اپنی شاعری میں منتقل کر دیا ہے۔ دراصل نفسانفسی کے عہد میں جھوٹ اور باطل کی پرستش نے حق خواہوں اور صداقت کے متوالوں کو وقتی طور پر خود صداقت سے دور کر دیا ہے اس لیے نعت کا تسلسل سے لکھا جانا وہ روشن تر امکان ہے جو اس جہان کے نیکی اور خیر سے ازلی تعلق کی ضمانت ہے۔ اس بامقصد منزہ و مطہر مقصد کو زندگی کے ہر سانس میں گھولنے والے صاحب اسلوب شاعر محمد امین ساجد سعیدی ہیں جو اُفقِ نعت پر اسم مصطفیٰ ﷺ کی برکت سے اپنی نعتیہ شاعری کے ہمراہ جلوہ گر ہوئے ہیں جو قرینہ اور سلیقہ عہد حاضر میں نعت گوئی میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے ساجد صاحب نے بھی وہی اسلوب اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں:

قافلہ سوچ کا جب مدینہ چلا
میں جہاں بھی رہا حاضری ہو گئی

ظاہر ہے کہ جس ہستی کا اسم مبارک لب پر لانے سے پہلے دہن کو کوثر و تسنیم سے دھونے کی ضرورت عشاق کو پڑتی ہے اس ہستی کے اسم گرامی کی مدحت کرنے والے نے پہلے اپنے جذبے کی ہر رخ سے سیاحت کی اور پھر ایک مسافر کی طرح اس حیرت کدے کی سیر کا اظہار و بیان کر دیا کہ پڑھنے والے طیبہ کی فرزانگی کے عہد میں جھوم جھوم جائیں۔ دراصل محمد امین ساجد نے ظلم و ستم کے اس عہد میں آنکھ کھولی جب اس اسم گرامی کے دنیا میں گستاخوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ بزعم خویش ان دہریوں کے حصے میں جو ذلت لکھی گئی وہ تو انہیں مل ہی گئی۔ لیکن عشق رسول ﷺ کو محبت و عقیدت مصطفیٰ ﷺ کا یہ پیغام ملا کہ جہاں نیکی اور تقویٰ کا دائرہ مضبوط ہو رہا ہے وہاں شر کی موجودگی سے انکار کرنا بھی غیر منطقی ہے۔ بہر حال ایک صوفی شاعر کی طرح نعت سرائی میں اپنی مثال آپ محمد ساجد سعیدی بیک وقت کئی عہدوں میں زندگی گزارتے نظر آ رہے ہیں ایک وہ کیفیت زندگی جو ان کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے اور انہیں ان کے افکار کو بدلنا ضروری ہو چکا ہے تا کہ گمراہی کے سیل کے آگے بند باندھ کر زمانے والوں کو خیر الانبیاء کی عظمتِ بے مثال سے روشناس کرایا جائے۔ یوں انفرادی اظہار اجتماعیت میں ڈھل کر امین ساجد کو عہد حاضر کا صاحب اسلوب شاعر ٹھہراتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ستر ہزار نوری فرشتوں کا قافلہ
پابندِ صبح و شام ہے میرے حضور ﷺ کا

دراصل تقدس مآب شخصیات کے انبوہ میں خاتم الانبیا ﷺ کا بے مثال، جامع اور اکملی ہونا ایک ایسا نمایاں پہلو ہے جس پر ساری انسانیت کی نجات کا دارومدار ہے۔ نعتِ نبی ﷺ کے کہنے کا مقصد اگرچہ انفرادی ثواب کا حصول اور محبوبِ خدا سے حصول کرم بنیادی سطح پر موجود رہتا ہے مگر یہ ذکر اسقدر منور و تاباں ہے کہ جہاں بھی اندھیرا ہو اس ذکر کے معجزے سے اور اس اسم مبارک کی مشکل کشائی سے وہاں روشنی کے پھول کھلتے ہیں جس سے انسانیت کو گمراہی اور کج روی سے صراط مستقیم پر آ جانے کی تلقین و تبلیغ کے اثرات ہویدا ہوتے ہیں کیونکہ تخلیق خالق سے اپنے لیے باعث ناز ہستی کا سوال پیہم کرتی ہے تا کہ اس عظمت کے ربط کو ممکن حد تک اپنے قلوب میں موجزن کر کے کائنات کے اس حسین ترین معجزہ تخلیق وجہ تکوین کائنات سے اپنی خالی آنکھوں میں بینائی بھر سکے۔ خالی دل کو مودتِ رسول ﷺ سے مکمل کر سکے اور ذہن سے فاسد خیالات کو رخصت کر کے مدینہ کی تہذیب کا مرکز بنا سکے۔ ''حاصل پور'' سے تعلق رکھنے والے شاعر محمد امین ساجد سعیدی سے یقیناً اسی جذبے نے نعت لکھوائی اور پھر یہ اشعار نہ صرف روشنی کی طرح ہیں بلکہ اپنے ممدوح کے حوالے سے ستارے اور سورج اور مہتاب کی مانند روشن ہیں جبکہ مداح کے خلوص و صداقت کا جذبہ انہیں آسمان سے کہیں بلندی پر لے جا کر دیکھنے والے کی آنکھ کی محبت رسول ﷺ اور جذبہ اتباع رسول ﷺ کی آزمائش کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں!

ہے شہرِ نبی یاں پہ عقیدت سے چلا کر
آتے ہیں فرشتے یہاں پلکوں کو جھکا کر
اے دورِ ترقی تجھے کس بات پہ ہے ناز
جو کچھ بھی ملا ہے تجھے آقاﷺ سے ملا ہے

اس عہدِ مصروف کار میں اور غم انگیز معاشرے میں قلمکار کو کب ایک سکون کی گھڑی نصیب ہوتی ہے کہ وہ اپنے مصائب پر نظر ڈالے، اپنے اندر خوبیوں کے امکانات کا جائزہ لے اور سچے نبیﷺ کا سچا ذکر کر کے اس راہ مشکل کو آسان بنائے۔ اس لیے نعت گوئی امین ساجد کے ہاں ودیعتِ خداوندی ہے، کرم خداوند عزوجل ہے۔ کیونکہ کائنات کی چنیدہ شخصیات کو یہ فضیلت نصیب ہوتی ہے کہ وہ فضیلتیں بانٹنے والے آقا سید المرسلین کی نعت گوئی کے مقام سے گزر سکیں اور اس مقام کے اسرار میں خود کو بھول کر نعت کی دریافت کے مرحلے سے آشنا ہوں۔ ہم سنتے ہیں کہ فلاں مقام پر عاشقِ رسولﷺ کو زیارتِ روضہ اطہر کی خواہش نے مضطرب کیا اور خواب میں زیارت سے مشرف ہونے کے بعد اس منظر کو حقیقت میں بدلنے کے لیے وہ اب اس کے رنگ و روپ کو عالم تصور میں سجائے اس کوشش میں ہے جلد سے جلد روضۂ اطہر کی جالیاں اپنی مضطرب اور بے چین آنکھوں سے عالمِ حقیقت میں دیکھ سکے اور چوم سکے۔ اسی فکر اور خواہش میں مگن خود کو محبتِ رسولﷺ سے روشن کرنے کے بعد امین ساجد سعیدی دیگر مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے نبیﷺ کی شان و فضیلت سے واقف ہوں اور اپنے کردار کی تزین سیرتِ رسولﷺ سے کر کے اسلام کو نئی زندگی دینے کا آغاز کرسکیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

یہ شانِ بلالی ہے کہ سورج نہیں نکلا
وہ کسی تھی پر کیف اذاں سوچ رہا ہوں
میں درود سلام پڑھتا ہوں
جب طبیعت ملال ہوتی ہے

ثانی الذکر شعر میں درود اور وظیفہ ہے جو عشاقِ رسولﷺ مساجد و محافل میلاد میں مذکور کرتے ہیں لیکن امین ساجد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فنی حوالوں سے ذات اور کائنات کے درمیانی فاصلے کو دور کر دیا ہے اور رفیع الشان عظیم المرتبت رسول پاکﷺ کی منزہ و بے عیب شخصیت کو پوری انسانیت کے سامنے نجات دہندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ پہلے انہوں نے دنیا کو سمجھا جو ہر چیز کو سائنسی لیبارٹری میں ثابت کرنا ہوتی ہے پھر واقعہ معراج کا حوالہ دے کر دنیا کی سوچ کو معترف کیا۔ نصرانیوں کے لیے معجزہ مریم کا ذکر قرآن پاک کی مدد سے معلوم ہوا۔ براہیمی تھی تو حضرت اسمٰعیل کی خواب میں قربانی کی بشارت سے لوگوں کو آگہی ہوئی۔ جب خدائے وحدہ لاشریک نے قرآن پاک کے ذریعے دنیا والوں کو ہمارے عظیم المرتبت پیغمبرﷺ کے بارے میں تعارف کرایا تو نطق نے زبان کے بوسے لیے۔ امین ساجد کہتے ہیں۔

آپﷺ خلقت میں ہر ایک سے اولیں
اور بعثت میں پیغمبر آخریں
آپﷺ شاہِ عرب ، بادشاہ عجم
سرورِ دو جہاں رحمتِ عالمیں

یوں "مدینہ یاد آتا ہے" ہجر و وصال کی اس نورانی کیفیت کے ہالے میں مہتاب نعت کا طلاع ہے جو محمد امین ساجد سعیدی کے اندر موجود روشنی کا عکس ہے۔ ذکرِ رحمٰن میں مصروف نبیﷺ کے دیار کی زیارت کی تمنا اور اس خواہش کی تکمیل کے اعجاز نے شاعر کو ہمیشہ کے لیے مسافر طیبہ بنا دیا ہے۔ یہ خوش نصیبی کسی کسی کا حصہ ہے اور پھر نعت کے اس سفر میں فنی مہارت و ریاضت ادائے شعر میں خوش سلیقگی اور موثر ابلاغ کے لیے حسیاتی شدت کا موجود رہنا ساجد سعید کی شاعری کی وہ خوبیاں ہیں جنہوں نے ان کے اشعار میں موجود الفاظ و تراکیب کے حسن، تشبیہات و استعارات کی کامل ریاضت کو ثانوی حیثیت دی ہے اور عقیدت و اظہار عقیدت کو اولیت دی ہے۔ بلاشبہ محمد امین ساجد سعیدی عہد موجود کے چند نعت گو شعراء میں ابتدا ہی سے شمار ہو رہے ہیں جو اُن کے ہاں نعتیہ شاعری کے روشن تر امکانات کے امین بن چکے ہیں۔ ان کا نعتیہ مجموعہ "مدینہ یاد آتا ہے" مہتاب کی طرح طلوع ہوا ہے کیونکہ ان کا انفرادی احساس اجتماعت میں ڈھلتا ہے تو زبان عش عش کر اٹھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

عطا فرمایئے ساجد کو مرہم اپنی رحمت کا
کہ زخمی ہو چکا ہے اس کا تن من یارسول اللہ

دعا گو ہوں کہ خدائے حرف و صوت ان کے کلام میں مزید خوبصورتی اور برکت عطا فرمائے اور ان کی اس کاوش کو صدقۂ رسول محترمﷺ قبولیت کا درجہ دے کر مصنف کی نجاتِ اخروی کا باعث بنائے۔ آمین

بشکریہ: ماہنامہ الہام بہاولپور
مئی 2010

زاویوں کی پہچان

عاشق رحیل/لاہور

ڈاکٹر مختار احمد صاحب بزمی کی تخلیق ''پہچان کے زاویے'' پر کچھ لکھنے کے لیے ضروری ہے۔ پڑھے لکھے ہونے کے علاوہ ادب کے سمندر کا ان جیسا شناور ہونا بھی لازم ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ''ولی را ولی می شناسد'' اور میرے جیسا گہنگار ادب کے اس ولی کے ادبی اسرار و رموز جاننے کے لیے صرف ہاتھ پاؤں ہی مار سکتا ہے کامیابی کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ویسے کسی حد تک پڑھا لکھا تو میں بھی ہوں اور کام بھی وہی کرتا رہا ہوں جو ڈاکٹر صاحب کر رہے ہیں لیکن وہ ''حرفوں'' سے کام لیتے رہے ہیں اور میں ہندسوں سے کھیلتا رہا۔ اب پتہ نہیں کہ دوسروں کے لیے حرفِ مشکل کہیں یا ''ہندسے'' لیکن میں خود حرفوں کو مشکل سمجھتا ہوں کیونکہ جب کسی ہوشیار اور چالاک انسان کے متعلق بات کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے ''کہ آپ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو حرفوں کا بنا ہوا ہے'' ڈاکٹر صاحب وہ کمانڈر ہیں کہ صرف ان کے سامنے دست بستہ حاضر رہتے ہیں۔ وہ ان سے جو چاہیں کام لے سکتے ہیں۔ وہ مختار بھی ہیں اور عزمی بھی۔ ان کو دنیائے ادب پر پورا پورا اختیار ہے اور وہ کرنے کا عزم کرلیں اس میں کامیابی اور کامرانی حاصل کرسکتے ہیں۔ ان کی پہچان کے زاویے ان کی نظریں صحیح مقام تک لے جاتے ہیں اور وہ برے بھلے کی جانچ آسانی سے کر لیتے ہیں۔ اور میں ان زاویوں کو ناپنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب کھولنے سے پہلے اس کے بیک ٹائٹل پر ایک سرسری سی نظر پڑی تو ان کے کارناموں کی تفصیل دیکھ کر میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی کہ علم و ادب کے اس ہمالہ کو سر کرنا میرے اسے ہیچمدان کے بس کی بات نہیں ہو سکتی لیکن داناؤں نے کہا ہے کہ کوشش کرنا انسان کا فرض ہے۔ چنانچہ میں داناؤں کا قول نبھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کتاب کے مندرجات پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے رنگ برنگے پھولوں کی کیاری قاری کے سامنے پیش کردی ہے اور وہ کس بھی پھول کی مہک سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ ''پہچان کے زاویے'' کے پیشِ لفظ ''یہ عشق آساں نہیں''۔۔۔ سے پتہ چل جاتا ہے کہ آگے جا کر ہمیں کیا کیا کچھ پیش آئے گا لیکن یہ بات واضح تھی کہ جو کچھ بھی پیش آئے گا وہ نہایت خوشگوار ہوگا کیونکہ گھر کے بھاگ اس کی ڈیوڑھی سے ہی نظر آجاتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے والوں کو گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان بہت شگفتہ اور ذہنوں کو فرحت بخشنے والا ہے۔ وہ اس کتاب کے پیش کرنے کا جواز کتنے عمدہ اور منفرد طریقے سے کرتے ہیں۔ ان کا فرمان ہے کہ ''یہ تحریریں سامنے لانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ مصنف کی پیدائش اور افزائش کا جواز اس کی کتاب ہی ہوتی ہے۔ پہلے ہی اس میں کافی تاخیر ہوچکی ہے۔ ۔۔۔مرنے سے پہلے پیدا ہوجانا چاہیے'' اب مرنے سے پہلے پیدا ہوجانے'' کا خیال ڈاکٹر صاحب ہی کے زرخیز ذہن کی پیداوار ہوسکتا ہے۔۔۔لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے مصنف ہونے کے بارے میں شکوہ ہے کیونکہ وہ بہت آزردہ سا ہوکر اپنے آپ سے ہی پوچھتے ہیں کہ ''میں کیوں لکھتا ہوں؟'' اپنی آزردگی کا سبب لکھتے ہیں کہ ''میرے لکھے ہوئے لفظوں کو تو میری بیوی اور بچے بھی کم کم ہی پڑھتے ہیں۔۔۔'' ڈاکٹر صاحب کو اس صورتِ حال سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو انہوں نے ''آفاقی سچائی'' بیان کی ہے آپ کو افسوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ آپ اس صف میں اکیلے نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ اور بھی بہت سے ''دل زدگان ہیں'' بیویاں کسی کی نہیں پڑھتیں کیونکہ اُن کا منصب پڑھنا نہیں پڑھانا ہوتا ہے۔ ہم کس کھیت کی مولی ہیں ہوسکتا ہے کہ سقراط بقراط جیسے استاد بھی اپنی بیویوں کا پڑھایا ہوا ہی ہمیں پڑھاتے رہے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے لکھنے کی پالیسی کی پہچان بھی پہلے ہی کروا رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''مزاج کے اعتبار سے آپ راؤنڈر ہوں۔۔۔۔ تحقیق میرا منصب اور تخلیق میری محبت ہے۔ تنقید میں تاثراتی دبستان اور حوصلہ افزائی کا قائل ہوں۔ چیرنے پھاڑنے والی تنقید بلکہ تنقیص سے دور رہتا ہوں۔۔۔لوگوں کی خامیوں کی ٹوہ لگانے

کے لیے میرے پاس وقت ہے اور نہ ضرورت ۔۔۔'' میں نے کتاب کے پہلے سے آخری صفحے تک پڑھ کر دیکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے حکومت میں آجانے والی سیاسی پارٹیوں کی طرح اپنے منشور سے انحراف نہیں کیا بلکہ بڑی دل جمعی سے اس پر عمل کیا ہے۔ کسی پر بے جا تنقید کے تیر نہیں چلائے۔ ہم عصروں کو مشورے اور چھوٹوں کے سروں پر نہ صرف ہاتھ رکھا ہے بلکہ ان کی کامیابیوں پر دلی خوشی کا اظہار بھی کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ہر تحریر کو اس طرح پیش کیا ہے اور اندازِ بیان کو ایسا شستہ، برجستہ اور دل پذیر بنایا ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہنوں پر کسی قسم کا بار نہ پڑے بلکہ وہ ان کے لفظ لفظ سے لطف اندوز نہ ہوں۔ حالانکہ تحقیق اور تنقید لکھنے والے حضرات اپنے خیالات کو ایسی جناتی زبان میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی خامیاں اور کوتاہیاں زبان کے پردے میں ہی پوشیدہ رہیں۔ وہ ایسے ایسے ادق الفاظ اور ناقابلِ فہم تراکیب استعمال کرتے ہیں کہ ان کے سمجھنے کے لیے کسی ''کالے علم'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو سمجھنے کے لیے ہمارا ناقص علم ہی کام دے رہا ہے کیونکہ ہم سمجھیں نہ سمجھیں انہیں بہت اچھی طرح سے سمجھانا آتا ہے۔ یہی اچھے استاد کی خوبی ہوتی ہے۔

''پہچان کے زاویے'' کی ترتیب کچھ یوں ہے: اقبالیات۔ عسکری اور سلیم احمد۔ اردو پیش منظر۔ ادبی شخصیات۔ سماجی شخصیات۔ روحی رنگ اور متفرقات۔ اقبالیات میں تین مضمون ہیں اقبالؒ کا خواب۔ وحدتِ ملت۔ علامہ اقبالؒ اور افغانستان علامہ اقبالؒ اور بندۂ مزدور۔ پہلے مضمون'' اقبالؒ کا خواب ۔۔۔ کی تعبیر بہت خوبصورت تعبیر وحدتِ ملت کے طور پر کی ہے۔ یہ ان کا دوسرا خواب تھا جب کہ پہلا پاکستان کے قیام کا تھا۔ جو ان کی زندگی میں تو پورا نہ ہو سکا لیکن پورا ضرور ہو گیا تھا۔ دوسرا خواب ''وحدتِ ملت'' ابھی تک شرمندۂ تعبیر ہی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ''حرم کی پاسبانی'' تو رہی ایک طرف ہم تو ابھی تک اپنے گھر کی پاسبانی کے قابل بھی نہیں ہوئے۔ اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر اہلِ فرنگ کی پناہوں میں جا رہے ہیں۔ تحقیق کا کام بڑی جانفشانی اور ریاضت طلب ہوتا ہے۔ اس کے لیے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے ان دونوں سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ہر باب مختصر مگر جامع صورت میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین ''اقبال اور افغانستان'' اور علامہ اقبالؒ اور بندہ مزدور میں علامہ صاحب کی شاعری کے ان زاویوں کی پہچان کروائی ہے جن کی طرف بہت کم محققین کی نظر گئی۔ میرا خیال ہے کہ کسی اردو شاعر نے افغانستان کو اپنی شاعری کا موضوع ہی نہیں بنایا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں ''مسلح افواج کے جوانوں کے پرے مزارِ اقبالؒ پر اچھے لگتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ان جوانوں کو کلامِ اقبالؒ بھی پڑھنے کو دیا جائے انہیں بتایا جائے کہ جس مزار کی تم حفاظت کر رہے ہو اس کا پتھر سارے کا سارا اہلِ افغانستان نے بھیجا تھا۔ مزار کے اندر لیٹے ہوئے مردِ مومن کا روحانی وطن افغانستان تھا۔'' علامہ اقبالؒ مزدوری کے بارے میں اپنی سوچ کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں 'فکرِ اقبالؒ میں بندۂ مزدور کا مقام اس قدر بلند ہے کہ اقبالؒ کا کلام مزدور تحریک کا منشور کہا جا سکتا ہے۔ مشرق و مغرب کے بڑے بڑے مزدور رہنماؤں کے برعکس اقبالؒ مزدوروں کے سامنے محسنِ اعظم کے اسوہ حسنہ پیش کرتے ہیں۔ آپ نے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودی۔ اپنی مخالف بڑھیا کا بوجھ اٹھا کر اسے منزل تک پہنچایا۔ آپ کی بیٹی کے ہاتھوں پر چکی پیستے پیستے سیاہ نشانات پڑ چکے تھے۔۔۔ اقبالؒ مزدوروں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ رزقِ حلال کمانے کی تلقین بھی کرتے ہیں'' وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''اقبالؒ وہ واحد عظیم المرتبت فکری شاعر ہے جس نے مزدور کے پسینے کو اپنے اشعار میں جذب کر کے اسے مُشک نافہ بنا دیا ہے۔ ان کی دردمندی میں محنت کی مہک اور مزدور کے لہو کی بوباس موجود ہے'' انہوں نے بڑی محنت سے اقبال کے کلام سے مزدوری کے متعلق شعر تلاش کیے جبکہ وہ مزدور صرف اینٹیں گارا ڈھونے والے کو نہیں سمجھتے بلکہ ان میں وہ تمام محنت کش طبقات شامل ہیں جو اجرت کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔

حسن عسکری اور سلیم احمد کے تنقیدی فن کا ڈاکٹر صاحب نے بھرپور جائزہ لیا ہے۔ حسن عسکری کو وہ اردو کے مستند اور رجحان ساز افسانہ نگار بھی قرار دیتے ہیں اور جان دار قسم کی تنقید کے موجد بھی۔ حالانکہ وہ فطری طور پر افسانہ نگار ہی

تھے پھر وہ شعوری کوشش سے تنقید کی طرف راغب ہو گئے اور اس میں بھی ایک بلند مقام سے ہمکنار ہوئے ۔ ڈاکٹر صاحب کی ان کے متعلق یہ رائے ملاحظہ فرمایئے ''ہمارے عہد کا کوئی بالغ نظر نقاد اور قاری محمد حسن عسکری کی تحریروں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا''۔ ''عسکریات'' اب سکۂ رائج الوقت ہے ۔ سلیم احمد کو وہ ''غالب شکن'' نقاد قرار دیتے ہیں ۔ انہوں نے غالب شکنی کیسے کی ؟ ڈاکٹر صاحب نے نہایت دیدہ دلیری سے تحقیق کرتے ہوئے اپنے خیال کے حق میں بہت کنوینسنگ قسم کی مثالیں دی ہیں ۔

کتاب کے ٹائٹل ''پہچان کے زاویے'' کے نیچے لکھا ہے کہ ''تحقیق و تنقید'' لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے ساتھ ''تخلیق'' بھی ہونا چاہیے تھا ۔ کیونکہ ایک تو ان کی تحقیق و تنقید میں ہی تخلیق کا رنگ نمایاں ہے ۔ دوسرے میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ زبان میں شگفتگی ہے اور تحریر میں کشش ''ادبی شخصیات'' اور ''متفرقات'' میں تو ڈاکٹر صاحب بالکل انشائیہ نگار لگتے ہیں ۔ تحریر میں مزاح کا رنگ اور بات سے بات پیدا کرنے کا ڈھنگ موجود ہے جسے پڑھ کر ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہی انشائیہ لکھنے والے کی خوبیاں ہوتی ہیں ۔ شخصیات میں عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد صاحبان کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے ''اصل میں دونوں ایک ہیں'' عنوان پڑھ کر ہی مزا آ جاتا ہے اور دونوں شخصیتیں نمایاں ہو جاتی ہیں ۔ اگرچہ یہ مضمون تیس سال پہلے کا لکھا ہوا ہے لیکن اس کی تازگی ابھی تک برقرار ہے اور حقیقت بھی ہے ۔ یہاں زیادہ مثالیں نہیں دی جا سکتیں ۔ صرف یہ بتاتا ہوں کہ وہ اپنا مضمون ''چاند کا ہم سفر ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر ایوب ندیم کیسے شروع کرتے ہیں'' استادِ گرامی ڈاکٹر انوار احمد کا فرمان ہے کہ اور قدرے سخت فرمان ہے ۔ ویسے اکثر اساتذہ کے فرامین بوجوہ سخت ہی ہوتے ہیں ۔ اس لیے مثالی استاد کی نظر شاگردوں کے جیبوں اور گریبانوں پر نہیں بلکہ ان کے مستقبل پر ہوتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کا فرمان ہے کہ اور قدرے سخت فرمان ہے ''ایسے استاد کو خودکشی کر لینی چاہیے جس کے دو چار نامور شاگرد نہ ہوں'' کتنے عمدہ اور پرکشش طریقے سے آغاز ہے مضمون کا ۔

''متفرقات'' میں تو ڈاکٹر صاحب کا مضمون ''چائے، لسی، ادب اور قومی تعمیر'' تو ہے ہی ایک کامیاب انشائیہ ۔ اس کے آغاز سے لے کر اختتام تک ایک ایک فقرے میں مزاح موجود ہے جسے پڑھ کر طبیعت کھل اٹھتی ہے ۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے آپ سب کو ایک پیغام بھی دیا ہے ۔ اسے سنیے اور اس پر عمل کیجیے وہ کہتے ہیں:

''اب سرکاری درباری افسران ہر کام میں خودکفیل ہو چکے ہیں ۔ وہ ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی اور دانشور بھی ۔ اب مناسب ہوگا کہ اصلی ادیب اور شاعر چائے بنانا سیکھ لیں ۔ خود بھی پئیں اور دوسروں کو بھی پلائیں ۔ بلکہ بہتر ہوگا کہ چائے کا کھوکھا بنا لیں اور ادب کو کھوہ کھاتے میں ڈالیں''۔

❁❁❁

غزل/حکیم سلیم اختر ملک

ازل سے ہوا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
خدا جانے کیا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
خزاں نے یہ کیا رنگ بدلا ہے اپنا
گلوں کو صبا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
نظر کو اچانک یہ کیا ہو گیا ہے
ترے نقشِ پا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
نظر آ رہی ہے بھنور میں جو کشتی
کوئی ناخدا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
میں دانستہ آتا نہیں ہاتھ اس کے
وہ جانِ ادا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
تعاقب میں یوں تو ہزاروں ہیں لیکن
وہ میرا پتہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے
عجب دور میں لوگ داخل ہوئے ہیں
حیا کو ردا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
کوئی اُس کو دیتا نہیں ہے دلاسہ
محبت صلہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے
کیا جب سے گھر میں دیا میں نے روشن
میرا گھر ہوا ڈھونڈتی پھر رہی ہے
اُٹھاؤ ذرا ہاتھ تم اپنے اختر
کہ ان کو دعا ڈھونڈتی پھر رہی ہے

....

پھول سے چہروں نے تسکین انا کی خاطر
وادیِ عشق کو پرخار بنا رکھا ہے
تم کسی ایک کے ہو کر نہیں رہتے اختر
تم نے تو عشق کو بیوپار بنا رکھا ہے

آ کھ غلام فرید الف

نسیم سحر/اسلام آباد

اولیائے کاملین میں جتنے بھی شاعری کے ذریعے اپنا پیغام پہچانے کے لیے چنے گئے ان کی شاعری اکتسابی یا وہبی کے زمرے میں نہیں آتی بلکہ اسے وجدانی یا الہامی شاعری کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے جذبات شعروں کی صورت میں اُس وقت منتقل کرتے ہیں جب ان پر حالتِ وجد طاری ہوتی ہے۔ شاہ حسین لاہوری، بلھے شاہ قصوری، سلطان باہو، سچل سرمست اور شاہ لطیف بھٹائی جیسے صوفیاء کی طرح حضرت خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ کا شمار بھی انہی قادر الکلام شعراء میں ہوتا ہے مگر ان کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے کافی کی صنف کو ذریعۂ اظہار بنایا اور اسے درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ ان کی کافیاں سن کر یا پڑھ کر انسان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ ان کی شانِ نزول روحانی کشف ہے۔

خواجہ غلام فرید سرائیکی کے علاوہ عربی، اردو، فارسی زبانیں بھی جانتے تھے اور اردو میں بھی آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے مگر ان کے حقیقی جذبات کا اظہار ہی اپنی مادری زبان سرائیکی ہی میں ہوا ہے اور ان کا کافیوں میں لفظوں کی تکرار، ہم صوتی اور ہم آہنگی سے عجب حسن و نغمگی پیدا ہوئی ہے اور ان کے پیغام کی گہرائی اور معرفت و روحانیت میں ایک ایسی کیفیت مسلسل لپکتی جھپکتی محسوس ہوتی ہے کہ اسے سن کر وہ لوگ بھی سرائیکی زبان نہیں جانتے، ان کا پیغام اپنے دل کے تاروں پر موصول ہوتے ہیں اور روح کے اندر اترتے محسوس کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی شاعری کا سفر زمانی اور مکانی دونوں سمتوں میں ان کی رحلت کے بعد بھی مسلسل جاری ہے۔ دراصل خواجہ صاحب ایسے شاعر کے پیغام کی کوئی عمودی اور افقی حدیں نہیں ہوتیں اور زبانی یا مکانی تغیرات ان پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

خواجہ صاحب کی شاعری، بلکہ زندگی بھی ''ہمہ اُوست'' کے فلسفے یا نظریے کی عکاس تھی اور دیکھنے والوں نے یہ منظر اسی وقت دیکھ لیا تھا جب ابھی خواجہ فرید رحمتہ اللہ علیہ کی عمر ساڑھے تین برس تھی اور ان کی رسمِ بسم اللہ ادا ہونے والی تھی۔ اس دم حضرت خواجہ تاج محمود نے آپ کو بسم اللہ پڑھانے کے لیے آپ کی انگلی پکڑ کر حرف الف پر رکھی اور فرمایا '' آ کھ غلام فرید، اَلف''۔ حضرت خواجہ تاج محمود کئی مرتبہ یہ کہہ چکے ہیں تو خواجہ غلام فرید نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ محض لفظ ''اَلف'' کہنے کی بجائے پورے الفاظ'' آ کھ غلام فرید الف'' کچھ اس انداز میں ادا کیے کہ خواجہ تاج محمود پر وجد طاری ہو گیا اور وہ بار بار نوائے مبارک پر ہاتھ مار کر یہی کہنے لگے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت محبوب الٰہی نے قوال طلب کیے اور طبلے کی تھاپ پر '' آ کھ غلام فرید الف''، مسلسل پڑھا جانے لگا تب کہیں خواجہ تاج محمود اس کیفیت سے نکلے!

چنانچہ اگر خواجہ غلام فرید کی پوری شاعری کو دل کی آنکھ اور روح کی بصیرت سے پڑھا جائے تو نقطۂ آغاز انتہا تک وہ'' آ کھ غلام فرید اَلف'' کی تفسیر اور تشریح ہی نظر آتی ہے۔ ان کی کافیوں میں عشق و محبت، سوز و گداز، ہجر و فراق، ساون کے دلفریب مناظر اور بادلوں کی گھن گھرج، جٹیوں کی چھاچھ بلونے کی منظر کشی ان کی شاعری کی اصلی اور باطنی کیفیات کی صرف خارجی مظاہر ہیں اور ان کا اصلی آفاق ابلاغ اس جہت سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ ان پر محبوبِ ازل کی خاص نظر تھی جس کی وجہ سے ان پر کشف و الہام کی نوازش ہوتی رہی جسے عطائے جمالی کہا جاتا ہے، مگر وجودِ مطلق جب جلال میں آتا ہے تو پھر مشاق اس شانِ جلالی سے جان پر کھیلنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید پر بھی جلال و جمال کی ان کیفیات کا نزول ہوتا رہتا تھا اور یہی کیفیات ان کی کافیوں کا موضوع ہیں جن میں وحدتِ وجودی کے مسلک کی ترجمانی کی گئی ہے اور ان کے آفاقی پیغام کا پھیلاؤ بھی '' آ کھ غلام فرید الف'' کی ہی تفسیر و تعبیر ہے۔

آپ نے جو پیغام پہنچانا تھا غالباً وہ کافی کے علاوہ شاعری کی کسی صنف کے ذریعے اتنے موثر طریقے سے اتنے وسیع حلقے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ فلسفۂ ہم اوست کی تائید میں ہے۔ توحید وجودی ان کے شعور و لاشعور کا حصہ تھی۔ ان کے نزدیک کائنات کا ہر وجود حسنِ ازل کا ایک حصہ ہے اور تمام موجوداتِ عالم اسی کے مظہر ہیں۔

ہے عشق دا جلوہ ہر ہر جا
سبحان اللہ سبحان اللہ
خود عاشق خود معشوق بنڑی

سبحان اللہ سبحان اللہ
خود بلبل تے پروانہ ہے
گل شمع اُتے دیوانہ ہے
تھی چاند چکوروں موہ لیا
سبحان اللہ سبحان اللہ

معرفت سے قلندری کی جانب سفر کے عارفِ کامل پر کچھ اور اسرار کھلتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید کی ایک کافی میں اسی حوالے سے قلندر کو حالات، مقامات اور کرامات سے تجاوز کی منازل طے کرتے دکھاتے ہوئے یوں کہا گیا ہے۔

اساں سو بدوست قلندر ہوں
کڈیں مسجد ہوں کڈیں مندر ہوں
کڈیں چور بنڑوں کڈیں توبہ استغفار بنڑوں
کڈیں زہد عبادت کار بنڑوں
کڈیں فسق فجوریں اندر ہوں
(فرید آگے اسی کافی میں کہتے ہیں :)
دل واتوں سمجھ فرید الا
کر محض نہ شعر جدید ولا
ہے چالوں حال پدید بھلا
تو نڑے کجھ سارے ابتر ہوں

ایک اور کافی میں وحدت الوجودی فلسفے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

بنڑ صورت شکل جہان آیا
ہر صورت عین عیان آیا
کتھے آدم نے کتھے شیث نبی
کتھے نوح کتھے طوفان آیا
کتھے ابراہیم خلیل نبی
کتھے یوسف وچ کنعان آیا
کتھے عیسیٰ نے الیاس نبی
کتھے لچھمن رام تے کان آیا
بوبکر عمر عثمان کتھاں
کتھے اسد اللہ ذیشان آیا
کتھے حسن حسین شہید بنڑے
کتھے مرشد فخرِ جہان آیا
کتھے احمد، شاہ سولاں دا
محبوب سبھے مقبولاں دا
اُستاد نفوس عقولاں دا
سلطانِ سر سلطان آیا

اسی کافی میں اسرار و رموز کھولتے کھولتے شاید کسی اندرونی اشارے کے تحت کہتے ہیں:

خاموش فرید اسرار کنوں
چپ بے ہودہ گفتار کنوں
پر غافل نہ تھی یار کنوں
ایہو لاریبی فرمان آیا

خواجہ صاحب کے کلام کے وجدانی اور الہامی ہونے کے حوالے سے یوں بھی ہوا کہ بعض اوقات شعر تو ان کی زبان پر آ جاتا مگر مفہوم خود ان پر بھی ایک عرصے کے بعد واضح ہوتا۔ ایک مرتبہ ایک کافی میں آپ نے لکھا: ''کتھاں واسی شہر جلندروں'' تو آپ خود بھی اس سے شہر جالندھر مراد لیتے رہے حتیٰ کہ سولہ برس بعد ان پر القا ہوا کہ ''جلندر'' سے مراد ''جَل اندر'' ہے یعنی پانی یا دریا کے اندر اور اشارہ مائی سوہنی کی طرف تھا جو دریا میں ڈوب گئی تھی۔

الغرض خواجہ صاحب کا کلام پڑھا جائے تو صاحبانِ نظر اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے اول تا آخر'' آکھ غلام فرید صاحب'' پر ہی عمل کیا ہے اور صاحبو، دنیا میں بھلا اس کے علاوہ ہے بھی کیا! اسی لیے تو کہا گیا ہے ''الفوں بس کریں او یار!

غزل/نسیم سحر

گنتی کے چند لوگ مراعات یافتہ
باقی کہاں ہیں ایسے عنایات یافتہ!
دِل جب سے ہجر کا ہے مُدارات یافتہ
آنکھیں ہوئی ہیں موسمِ برسات یافتہ
کیسے لڑیں گے جنگ ہمارے حقوق کی
پشتوں سے ہیں جو لوگ مفادات یافتہ
باہر نہ آسکیں گے وہ ملبے کے ڈھیر سے
دعویٰ جنہیں ہے، وہ ہیں کرامات یافتہ
اب امن ہو تو نیند ہی آتی نہیں ہمیں
کچھ اتنے ہو چکے ہیں فسادات یافتہ
اس جنگ میں ہمارے تھے جتنے کماندار
نکلے ہیں سب عدوّ کے ہدایات یافتہ
اس شہر میں کبھی نہیں اترے گی روشنی
یہ شہر تو سدا سے ہے ظلمات یافتہ
مدت سے اک خلا میں مقید ہیں کیوں نسیم
ہم لوگ، جو ہیں ارض و سماوات و یافتہ

ایاز محمود ایاز کی شاعری

میاں عامر محمود/سری لنکا

ایاز محمود ایاز نو جوان نسل کے نمائندہ شعرا میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں شعر کی جو جوت جل رہی ہے اس کی روشنی دور دور تک بکھرانے والی ہے۔تخلیق کے خداداد جوہر کے علاوہ محبت میں بھی یہ کسی سے پیچھے نہیں۔اتنی نوعمری میں شاعری کی سات کتابیں تخلیق کر چکا ہے جو اپنی جگہ ایک کارنامے سے کم نہیں۔ایاز محمود ایاز عروس البلاد پیرس میں رہتا ہے اور وہاں بھی ادبی محفلوں کی نہ صرف جان ہے بلکہ عملی طور پر بھی نہایت متحرک ہے۔

سنجیدہ طبع اور خوبرو ہونا ایاز محمود ایاز کی اضافی کشش ہے جس کے پیرس کے ادبی حلقے یقیناً گواہ ہیں۔یہ وطنِ عزیز کے ادبی حلقوں میں بھی اپنی ایک پہچان رکھتا ہے اور جب پاکستان کے دورے پر ہوتا ہے تو مختلف ادبی محافل میں ایک معتبر انداز میں شمولیت کرتا ہے۔وہاں پر بھی اس کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ہے جو اس کے فن کے قدردان ہیں۔

شعر کا فن اکتساب سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔یہ ایک خداداد نعمت ہے جسے مسلسل محنت اور جانفشانی درکار ہے اس میں دن اور رات دونوں جاگ کر گزارنے پڑتے ہیں۔ایاز محمود ایاز ان مسلسل بیداریوں سے مکمل طور پر آشنا لگتا ہے۔اس کے شعر میں جوانی ،جذبات کی حدت اور تجربے کی متانت ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں اور زندگی کی تمازت اور مشاہدے کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں۔

اردو شاعری ہر دور میں غزل اور نظم دونوں سے عبارت رہی ہے۔شام آفاقی حیثیت کا حامل ہو تو غزل کی تنگنائے بقدر شوق محسوس نہیں ہوتی۔اور بیان کے لیے ان کو کچھ اور وسعتیں درکار ہوتی ہیں۔دنیا کا بہت بڑا ادب طویل نغموں کی صورت میں تخلیق ہوا ہے۔چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب تخلیق کا نسخہ وارد ہوتا ہے تو شعر پہاڑ سے اترتے ہوئے دریاؤں کی طرح خود اپنا راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔غزل ہو یا نظم وہ اپنی شکل وصورت اپنے ساتھ لاتی ہے اور تخلیق کار کا سچا تخلیق کار ہونا ضروری ہے ایاز محمود ایاز نوعمری میں ہجرت کے آزاروں سے گزرتا ہے۔اپنا وطن اور اپنے اہلِ خانہ چھوڑ کر نئی دنیا بسانے نکلتا ہے چنانچہ اس کے دل میں جذبوں کا آتش فشاں موجود ہوتا ہے کہنے کی بات نہیں۔وہ اپنی آگ ساتھ لیے پھرتا ہے پھر تخلیق کے لمحات میں اسی آگ سے پھول بناتا ہے۔چنانچہ ایاز محمود ایاز اس کا لاہور کی گلیوں میں اکیلے پھرنا اور پیرس کے راستوں سے آسانی پیدا کرنا ایک ہی عمل ہے۔اس کی موجودگی ایک ہی لمحے میں لاہور اور پیرس دونوں جگہ ہو سکتی ہے۔جو اس سنسنی کی تخلیق کا باعث بنتی ہے جو اس کی شاعری میں اضطراب اور طمانیت کی دورنگی کو یک رنگی میں تبدیل کرتی جا بجا نظر آتی ہے۔

اپنے جذبے کے اظہار کے لیے وہ کسی روایت اور تقلید کا پابند نہیں۔غزل اور نظم دونوں میں اظہار کی قدرت رکھتا ہے۔وہ قدامت پسند ان معنوں میں ہے کہ ادب اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور جدید ان معنوں میں ہے کہ اسے زنجیریں توڑنے میں لطف آتا ہے۔

ایاز محمود ایاز کا شعری سفر اپنے آپ میں گم ہو کر کوئی سراغ پا لینے کا پابند ہے۔اب شاعر نوعمری میں ہی شعر کی مرکزی رُو سے الگ ہو جائے تو اصولاً اُس کے اکتسابِ علم کے راستے بند ہو جانے چاہئیں۔لیکن جو روحیں اپنے اندر علم و ادب کی ایک ابدی پیاس رکھتی ہوں وہ ادب سے اپنے رابطے ٹوٹنے نہیں دیتیں۔ان کی پیاس اور بھڑک اٹھتی ہے بغور دیکھا جائے تو انہیں اپنے اطراف میں رحمت کا ایک نیا چشمہ جاری نظر آتا ہے اور وہ اس سے جتنی پیاس چاہے بُجھا سکتی ہے۔

البتہ اس میں محبت زیادہ پڑتی ہے اور اس کے لیے شوقِ فضول اور جرأتِ رندانہ درکار ہوتی ہے یہ شوقِ فضول ایاز محمود ایاز میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ اپنی فعالیت سے اپنے ہونے کا احساس ہمہ وقت دلاتا رہتا ہے۔اس کے اب تک کے سات شعری مجموعے (1+1+1+1+1+1+1) اس بات کا اظہار ہیں۔اس کی لگن میں یہی ہے کہ اس کے پیشے کا کوئی خشک وٹر کو تاہ نہ رہ جائے۔اس کے کلام میں صفائی اور سادگی ہے۔مناسب مقام پر مناسب الفاظ کا استعمال اس کی علم معانی سے شناسائی پر دال ہے۔ایاز محمود ایاز کا رتبہ یہ مصر یوسف نہیں ہے چاہ بے زندان پہنچتے پہنچتے یہ مصر کا ایک چکر لگا آیا ہے لہذا صرف خوابوں کی تعبیریں ہی نہیں بتاتا خود بھی خواب دیکھتا ہے اور یہ اپنی جگہ پر ایک عظیم نعمت ہے۔

ایاز کی شاعری جھیل کے پانی کی نیلگوں سطح پر

لرزتے ہوئے اس کنول کا عکس ہے جسے قلم کی زبان سے ادا نہیں کیا جا سکتا ممکن ہے کسی بڑے مصور، کسی مشاق فوٹو گرافر کو اس بارے میں شائد پیش رفت کی کچھ سبقت حاصل ہو جائے لیکن شعری احساس تصویر میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ تصویر اور لفظ میں یہی فرق ہے کہ تصویریں بولتی نہیں لیکن الفاظ بولتے ہیں۔ اور دور تک ان کی گونج سنائی دیتی ہے آج فرانس میں بیٹھے ہوئے ایاز کو ہم نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ سن بھی سکتے ہیں اور دو طرفہ گفت و شنید کے لیے انہیں عام سے موبائل فون سے بھی یہ کام لے سکتے ہیں۔ جدید ایجادات و اختراعات کے عیوب اپنی جگہ لیکن محاسن اور اہمیت پر بھی کھلے دل سے بل گیٹس کو داد دینی چاہیے۔

داد کے سلسلے میں ہم بالخصوص شعراء انتہائی کنجوس، بخیل، بے حُسن اور بے فیض لوگ ہیں۔ کسی کی اچھی تخلیق پر داد دیتے ہوئے ہماری جان لبوں پر آجاتی ہے، الفاظ حلق میں اٹک جاتے ہیں۔ ہاتھ اور سر کی منافقانہ جنبشوں سے ہم مخاطب کو داد تو ضرور دیتے ہیں لیکن جوابی وار کی شرط کے ساتھ!

جہاں تک ایاز اور اس کی شاعری کا تعلق ہے مجھے دونوں ہی پسند ہیں۔ ایاز محبت کے حوالے سے ، شاعری وابستگی کے حوالے سے۔ دونوں حوالے بلا کم و کاست طمانیت بخش ہیں۔ وہ کسی کی برائی نہیں کرتا، کسی سے لڑائی نہیں کرتا کیونکہ اس کا پیغام محبت ہے، امن ہے، فاختہ ہے اور زیتون کی شاخ ہے۔ جس زخمی فاختہ کی چونچ میں زیتون کی ننھی شاخ ہے وہ امن کی تلاش میں اڑتی پھر رہی ہے غالباً یہ دنیا بھر کے تمام ایٹمی گھروں کا چکر لگا چکی ہے جبھی بڑی طاقتیں تخفیفِ اسلحہ کی جانب راغب ہوتی ہیں۔ اور ہو رہی ہیں۔ کیونکہ دنیا ایٹم کی تباہ کاری کا نقشہ دیکھ چکی ہے۔

ایاز کے موضوعاتِ سخن سادہ اور سلیس ہیں۔ آسانی سے پڑھے، سمجھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں وہ ایسا رانجھا ہے جسے ہیر کو منانے کے لیے مکالمات افلاطون، حصہ اول تا ہشتم کی ضرورت نہیں۔ بس ایک ونجلی کافی ہے۔ یہ بانسری اس کی شاعری ہے۔ اسی شاعری سے وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ نئی کتاب بھی اس رانجھے کی ونجلی کا نیا نغمہ ہے، دیکھنا یہ ہے کہ کتنے لوگ اس پر سر دھنتے ہیں اور کتنے کان دل کی آنکھوں سے اسے سنتے ہیں۔

اعتبار ساجد

مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ ایاز محمود ایاز کا تازہ مجموعہ ''مجھے تم ہار بیٹھو گے'' اس حبس میں زدہ ادبی موسم میں ایک لطیف اور پرسرور ہوا کا جھونکا ثابت ہوگا

اگر اب مصلحت کوشی کو خود پہ دھار بیٹھو گے
یہ گھڑیاں فیصلے کی ہیں مجھے تم ہار بیٹھو گے
محبت کے زمانے کے پرانے خط ہی پڑھ ڈالو!
کہاں تک شامِ جاں لیوا میں یوں بے کار بیٹھو گے
بہت نزدیکیاں اچھی نہیں ہوتیں مری جاناں
رہیں کچھ فاصلے ورنہ محبت مار بیٹھو گے

فروغِ ادب کے لیے وقف

شاہکار علمی، ادبی اور فکری تحریروں کا جریدہ

ماہنامہ بُک ڈائجسٹ، لاہور

بہ یاد: سیّد قاسم محمود   مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ

براہِ کرم اپنی اُردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری و نثر) کمپوز کروا کے ان پیج ای میل کر دیا کریں۔

آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

برائے خط کتابت/ترسیل زر/رابطہ: بُک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور 0333-4377794

bookdigest@hotmail.com / kitabvirsa@gmail.com

''محبت بھوت ہے شاید''

نازاوکاڑوی

یہ ہے سہیل اسجد کا ''خیالِ دید'' کے بعد دوسرا شعری مجموعہ شاید یہ ان کی قلبی واردات ہے۔ ''محبت کا بھوت'' ان پر سوار ہو کر اُترنے کا نام نہیں لے رہا۔ سہیل اسجد نے مرتضٰی ساجد، سیّد علی حسن شیرازی، رفیق کشمیری اور محمد اختر خان جیسے معتبر پیروں سے بھوت اُتارنے کی سعی بھی کی ہے۔ ان سب حضرات نے بھوت کی موجودگی کو تسلیم تو کیا لیکن اسے اُتارنے میں مدد کرنے سے قاصر نظر آئے۔ بلاشبہ اگر بھوت اصلی ہو تو کسی پیر فقیر کی جنتر منتر سے نہیں اُترتا اور بالآخر بھوت سے سمجھوتہ کرنا اور ساتھ رہنا ہی عافیت ہوتا ہے۔

سہیل اسجد نوجوان ہے زرخیز ذہن ہے، جہاں یہ محبت کے بیج بوتا ہے وہاں خود رومحبت کے دل نشیں پھولوں سے بھی اپنا دامن بھر لیتا ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل مرتضٰی ساجد کا دیباچہ ''خود ساختہ'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ موصوف نے سہیل اسجد کی دل جوئی کرتے ہوئے اوکاڑا کی ادبی صورت کا تذکرہ کیا ہے۔ ہر چند میں ان سب باتوں حالات و واقعات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن مرتضٰی ساجد کے لیے ایسا اظہارِ خیال کرنا نامناسب سمجھتا ہوں۔ وہ اس لیے کتاب کا دیباچہ ہو فلیپ ہو یا رائے تو وہ صرف کتاب تک وقف رہنی چاہیے۔ ہاں اگر آپ کو سٹیج پر یا کسی ایسے پلیٹ فارم کی دستیابی پر دل کی بھڑاس نکال سکتے ہیں۔ آپ کا یہ صفحہ ڈیڑھ صفحہ سارے مضمون کو گہنا گیا ہے۔ یقیناً سہیل اسجد نے بھی محسوس کیا ہوگا لیکن آپ کی توقیر میں لب خاموش رہا ہوگا۔ خیر یہ مرتضٰی ساجد کی صوابدید ہے وہ ایسا کر گئے۔ شازیہ اکرم نایاب نے سہیل اسجد کو اُفق پر چمکنے والے تمام ستاروں میں نمایاں ستارہ قرار دیا ہے۔

سید علی حسن شیرازی بھی سہیل اسجد کے لیے محبت کا گوشہ رکھتے ہوئے کہتے ہیں ''سہیل اسجد محبت کی تصویر میں بھی بالکل اسی طرح وہ رنگ بھرتا ہے جس سے محبت کی شکل بے رنگ سی ہونے لگتی ہے۔ چونکہ سہیل اسجد کے لیے ''محبت'' کے دائرے سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔ اس لیے ان تمام تجربات سے وہ محبت کو کبھی بے رنگ، کبھی بے معنی اور کبھی اس فرش سے عرش تک لے جاتا ہے، رفیق کشمیری یوں رقم طراز ہیں ''سہیل اسجد کی شاعری بڑے خوبصورت جذبوں سے مزین ہے۔'' محمد اختر خان کے مطابق ہجر اور ہجرت سہیل اسجد کے خاص موضوعات ہیں۔ سہیل اسجد اک حیران مسافر کی طرح مٹی کے دھاگے سے بندھے رشتے نبھا رہا ہے۔''

اب میں سہیل اسجد کی شاعری پر اپنی ناقص رائے دینا چاہوں گا۔ سہیل اسجد کو مکمل اختیار ہے کہ دوسرے خیالات یا رائے زنی کو یکسر مسترد کر دے۔ 144 صفحات کی بہترین کاغذ اور خوبصورت طباعت کے ساتھ قاری کے دل کو بھاتا یہ شعری مجموعہ اپنی تمام تر رنگینیوں اور خوشبو سے عطر بیز فضاؤں میں اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔ حسب روایت ابتدا حمد کو چھوڑتے ہوئے نعت سے کرتے ہیں۔ عشق رسولؐ میں ڈوبا ہوا شعر ملاحظہ ہو:

آپؐ کی رحمت کے صدقے یا نبیؐ
میں ثنا خوانی کے قابل ہو گیا

ہم مسلمان تو کیا غیر مسلم بھی واقعہ کربلا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ دنیا کا غیر فطری اور شقی القلبی کا یہ پہلا واقعہ اور پھر انسانی قربانی کی عظیم مثال کو آج تک زمانہ فراموش نہ کر سکا اور آج بھی ان بے گناہ شہیدوں کی عظمت کو سلام اور ان کے غم میں آج بھی نوحے لکھے اور پڑھے جا رہے ہیں۔ سہیل اسجد کا بھی اظہار دیکھیں:

اسجد اُداس چاند محرم کا دیکھ کر
مقتل میں سوگوار ہوئی کربلا کی شام

غزلیہ انداز کا یہ نوحہ پڑھنے لائق ہے۔

سہیل اسجد نے آزاد نظم کے پیرائے میں اپنا تعارف نہایت خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔ تعارف کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد وقوع پذیر واقعات کی بھی نشاندہی اس نظم کا ایک خاصہ بھی ہے۔ دور قدیم میں شعرا اپنا تعارف الگ اور شہر، محلّہ کی شاموں کی رنگینیوں کا تذکرہ الگ الگ رقم کرتے تھے۔ سہیل اسجد نے دونوں کام ایک ہی وقت میں کیے ہیں اور مسافر کو انہی معنوں میں استعمال کرتے ہوئے نظم کا عنوان ''مسافر'' منتخب کیا۔ آگے چل کر سہیل اسجد نے 16 اشعار پر مشتمل طویل غزل لکھی ہے۔ یہ غزل اس بات کی بھی غماز ہے کہ سہیل اسجد کا مطالعہ وسیع میدان دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اپنی اس غزل میں مطالعہ کے بل بوتے اپنے پسندیدہ شعرا کو نہ صرف خراج تحسین پیش کیا بلکہ ان کی گوناگوں خصوصیات کا ذکر اور اقوال بیان کرتے ہوئے ان کے افکار کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ میرے مطالعے میں یہ پہلی غزل ہے جس میں تواتر کے ساتھ اتنے شعرا کا تذکرہ دیکھنے میں ملا۔ مثلاً اقبال سے ہوتے ہوئے غالب، انشا، ساغر، سقراط، ہابیل شاعر تو نہیں ایک تاریخی واقعہ سے نسبت کے ساتھ نثر و شاعری میں بطور مثال آتے ہیں۔ علاوہ ازیں دنیا کی بے ثباتی اور تلخ حالات کا احاطہ کیے ہوئے یہ منفرد غزل قاری نے یقیناً لطف لے کر پڑھی ہوگی۔ کچھ اشعار یوں ہیں:

مکر و فریب دل میں، لبوں پہ خلوص تھا
اک اور آدمی ہی ملا، آدمی کے بیچ
مٹی سے گر بنا ہے یہ پتلا تو پھر بتا
پتھر کا پھول کیسے کھلا، آدمی کے بیچ
انشاء بھی کوچ کر گئے شاید اسی لیے
بستی رہی نہ شہر وفا، آدمی کے بیچ
سقراط پی کے زہر پیالہ بری ہوا
پھر بھی نہ کوئی راز کھلا، آدمی کے بیچ
ساغر کی قبر سے مجھے آتی ہے یہ صدا
کیسی گزر رہی ہے سنا؟ آدمی کے بیچ

سہیل اسجد کو شاعری میں دلچسپی کیوں ہے۔ وہ اس کے لیے کیا کرتا ہے یا کیا کرتا رہتا ہے۔ نئی سوچ ہمیشہ عمل کو جنم دیتی ہے اور یہ عمل انسان کو عامل بنا دیتا ہے اور یہی عامل اپنے عمل سے کہیں تاج محل جیسے محل تعمیر کرتا ہے تو کہیں لازوال محبت کو انارکلی کو حیاتِ جاوداں کرتا ہے اور کبھی عقل سے ماورا دودھ کی نہر بھی رواں کر جاتا ہے۔ سہیل اسجد اپنے بارے میں یوں گویا ہوتے ہیں:

زمین قافیہ پیمائی سے بھری جائے
نئی ردیف میں تازہ غزل کہی جائے
اُداس جھیل سی آنکھیں خیال میں لا کر
دیار ہجر میں اب شاعری ہی کی جائے
جب تری یاد کے گلاب کھلے
وصل کی سمت چل دیا مصرعہ
صبح بستر پہ راکھ پھیلی تھی
خواب میں رات پھر جلا مصرعہ
پاؤں سے باندھ کر نئے جذبے
آپ کو ڈھونڈتا رہا مصرعہ

کہنہ مشق شاعر سہیل اسجد نے جہاں غزل کا جہاں آباد کیا ہے وہاں نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ میری اپنی رائے ہے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ نظم معریٰ ہو یا غیر معریٰ جتنی کم طویل ہوگی اتنی پسند ہوگی۔ طویل نظم اگر مشاعرے میں پڑھی جائے تو سامع اُکتا جاتا ہے۔ بسا اوقات شاعر عنوان کو بھی نبھا نہیں پاتا۔ یوں بوریت کا سماں بن کر سامعین کو گفت و شنید کی طرف راغب کر دیتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا ہر طویل نظم ایسی ہی ہوتی ہے فیض، فراز، ن م راشد یا نظم گو شاعروں کی طویل نظمیں شوق سے سنی گئی ہیں۔

اپنے دوست احباب کے لیے لکھی گئیں نظمیں اپنے ماحول میں رہتے ہوئے اچھی ہیں۔ مجید امجد کو بہترین خراج تحسین اچھی کاوش ہے۔ اس مجموعہ کا نام بھی اسی نظم سے اخذ کیا گیا ہے۔ ''محبت بھوت ہے شاید'' ذرا یہ بند دیکھیں:

ہزاروں داستانوں میں ہزاروں روپ رکھتی ہے
محبت دشت امکاں میں خزاں کی دھوپ رکھتی ہے
کبھی حیلوں بہانوں سے
کبھی ڈر کر زمانوں سے
کبھی جھوٹے فسانوں سے
اُتر کر آسمانوں سے
محبت ذات کی تکمیل کو بے نور کرتی ہے
بساطِ عشق پہ چلتے ہوئے انمول مہروں کو
تھکن سے چور کرتی ہے
بڑا مجبور کرتی ہے

اس بند میں سہیل اسجد نے محبت کے کیسے کیسے تانے بانے بنے ہیں آگے چل کر پھر اس طرح رقم طراز ہوتے ہیں:

محبت رتجگوں کے تیر کھا کر مسکراتی ہے
کبھی یہ چاندنی کی گود میں آنسو بہاتی ہے
کبھی آسیب کی صورت، بدن میں سانس لیتی ہے
کبھی یہ اجنبی دنیاؤں کی مخلوق کی صورت
سسکتے ہجر میں یہ مختلف شکلیں بناتی ہے
عذاب ہجر میں سلگتے ہوئے پرنم اسیروں کی پریشانی بڑھاتی ہے، مسلسل آزماتی ہے
محبت کی نہیں دنیا کہاں اس کا ٹھکانہ ہے
محبت خواہشوں کے قتل کا سچا فسانہ ہے
محبت انتہائے جبر میں گزرا زمانہ ہے
مکافاتی بہانہ ہے

حسرت و یاس سے گزر کر وفا اور جفا سے ماورا ہو کر صعوبتیں اُٹھاتے ہوئے قدم لڑکھڑاتے ہوئے اُمید و تیقن کے بھنور میں ڈوبتے ہوئے اپنی کہانی کا یوں انجام بیان کرتے ہیں کہ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو داد دیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ دوستوں نے بھی اپنے خوبصورت الفاظ کے جامے پہنائے ہیں۔ میں نے بھی جو پڑھا جو جانا، جو سمجھا اپنے تئیں اپنی رائے دینے کی سعی کی ہے۔

گر قبول زہے شرف

آخری بند اس بھوت کی حقیقت اشکارا کرتے ہوئے قاری کی تسلی تشفی کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ مجموعہ کے نام کے ساتھ انصاف ہوتا بھی نظر آ رہا ہے لکھنے کا وقت رات 2 بج کر 27 منٹ لکھا گیا ہے۔ اس وقت پر یقیناً بھوت ہی نازل ہوتے ہیں۔ اس سے قبل کوئی بھوت ہماری طرف لپکے سہیل اسجد کے لیے نیک تمناؤں کا متمنی رہوں گا۔ انشاءاللہ

تیقن میں سلگتے وہم کی تصویر ہے شاید
کہانی کار سے اُلجھی ہوئی تحریر ہے شاید
مقدس آگ میں جلتی ہوئی تشہیر ہے شاید
محبت رتجگوں کی بے کراں زنجیر ہے شاید
دبستانِ الم کا ہجرتی یاقوت ہے شاید
کہیں ہاروت کی جیسی کہیں ماروت ہے شاید
سمندر پار دنیا سے رُخِ طالوت ہے شاید
محبت بھوت ہے شاید

یکدم دُبئی

احمد سعید/ پرتگال

گھڑی کی سوئی نو پر آئی تو نو بج چکے تھے، ظاہری بات ہے نو ہی بجنے تھے، بارہ تو نہیں البتہ منہ پر بارہ ضرور بج گئے تھے۔ کیونکہ رات دو بج کر تیس منٹ پر فلائیٹ لاہور سے پرتگال روانہ ہونی تھی اور ہم ابھی فیصل آباد سے لاہور کی طرف روانہ نہیں ہوئے تھے۔ بیگم ابھی تک سامان پہ سامان اکٹھا کئے جا رہی تھیں۔ پانچ بیگ بڑے والے بھر چکی تھیں، اپنے لاتعداد کپڑوں سمیت ساگ، سویاں، مٹھائی یہاں تک کے بیٹی کی نیپیاں، اور جانے کیا کیا۔ جو چیزیں پرتگال سے عام اور سستی دستیاب تھیں وہ سب سے زیادہ بکسوں میں ٹھونسی ہوئیں تھیں، جس نے جو چیز پکڑا دی اس کو تبرک کے طور پر ساتھ رکھ لیا۔ میں یہ تماشہ بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا، ظاہری بات ہے دیکھنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ خیر نکل پڑے لاہور کی طرف، فلائیٹ دو گھنٹے دبئی رکنی تھی اور پھر سیدھا پرتگال۔ دو گھنٹے کی جگہ فلائیٹ دو دن دبئی رکنی ہوتی تو مزہ ہی آ جاتا۔

ائیر پورٹ پہنچے تو پتہ چلا کہ جہاز آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔ لاہور سے دبئی پہنچے تو جہاز سے نکلتے ہی ایک لمبے چوڑے شخص نے ہمیں روک لیا۔ مجھے لگا کہ ساگ اور آلو میتھی کے پراٹھوں کی وجہ سے اس نے ہمیں روک لیا ہے۔ اس نے دو کارڈ ہمارے ہاتھ میں تھما دیئے۔ میں نے سوچا، یہ "سونڈ بونڈ" منگتا ائیر پورٹ میں کیسے آ گیا۔ اس سے کہا، بھائی! ہمارے پاس ٹائم نہیں، ہم نے ایک گھنٹے میں دوسرے جہاز تک پہنچنا ہے۔ کہنے لگا، جس جہاز تک آپ نے پہنچنا تھا وہ اب جانے کہاں پہنچ گیا ہے۔ میں نے کہا، کیا مطلب ہے آپ کا؟ فرمانے لگے کہ جہاز اڑ چکا ہے۔ لاہور سے آپکی فلائیٹ دیر سے پہنچی ہے۔ آپ کو چھبیس گھنٹے دبئی میں رکنا پڑے گا، یہ کارڈ ہوٹل کے دو چِٹ ہیں، نیچے سے مفت میں ویزہ لگوائیں، باہر ہوٹل کی بس آپ کو فری میں ہوٹل پہنچا دے گی۔ میں اندر سے فل بتا فل خوش، پر اسے ظاہر کر رہا تھا کہ او ہو فلائیٹ مس نہیں ہونی چاہیے تھی۔ آخر پر اس نے کہا کہ ہوٹل میں رہائش آپ کو فری ہے۔ میں ہلکا سا مسکرایا پر میرے سارے کے سارے دانت خود بخود باہر کو نکل آئے۔ میں نے کافی کوشش کی کہ اب مسکرانا بند کروں پر بتیسی اندر ہی نہیں جا رہی تھی۔ دل نے کہا، اسے کہوں کہ ہوٹل فری والی بات آپ کو سب سے پہلے بتانی چاہیے تھی۔

نیچے آئے، ویزہ لگوایا اور "شٹل بس" کا انتظار کرنے لگے۔ پورے ائیر پورٹ میں بنگالی، پاکستانی، نیپالی اور اور بھی ممالک کے لوگ نظر آئے، پر عربی نظر نہیں آ رہے تھے، البتہ ویزے کے سیکشن میں صرف عربی ہی بیٹھے تھے۔ ایک شخص نے پاسپورٹ چیک کر کے فوراً ویزہ لگا دیا۔ شٹل بس ہر پندرہ منٹ بعد آ رہی تھی، اس پر بیٹھے اور ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل "جی جی کو" میں تھا۔ بیگم ساتھ تھیں شاید اس لیے ہوٹل جی جی کو میں دیا۔ انہیں پتہ لگ گیا تھا کہ بندہ بیگم کے آگے جی جی ہی کرتا پھرتا ہے۔ کاؤنٹر سے چابی لی اور انہیں پوچھا کہ ہوٹل میں انٹرنیٹ ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کو ایک گھنٹے کیلئے انٹرنیٹ اور ساتھ پانچ منٹ کی انٹرنیشنل کال بھی فری ہے۔ ناشتہ، لنچ بوفے اور ڈنر بوفے بھی فری تھا، بھئی دبئی ہے۔ ناشتہ چھ سے بارہ بجے تک کا ٹائم تھا، پہلے آٹھ بجے ناشتہ کیا پھر دس بجے کیا پھر بارہ بجے کے قریب دل کیا پر نہیں کیا، مجھے یاد آیا کہ لنچ بھی فری ہے۔ لنچ کر کے باہر نکل پڑے، دھوپ نکلی ہوئی تھی، ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، دور کھجوروں کے درخت بڑا خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے، اوپر سے فری کا "ٹرپ" منظر اور خوبصورت دکھنے لگا۔ ہوٹل کیساتھ ہی بس سٹینڈ تھا، تھوڑی دیر بس کا ویٹ کیا وہ (بس) نہ آئی تو ساتھ ہی میٹرو بھی تھی، ہم اسکی طرف چل پڑے۔ میٹرو پر بیٹھے اور جبل علی کی ڈائریکشن لی، راستے میں [illegible] دل کیا امریکہ بھی دیکھتے چلیں۔ شیخ زید روڈ New York کی بلند ترین بلڈنگوں سے مماثلت رکھتی ہے، ویسے میں نے نیویارک دیکھا نہیں ہے، لیکن ایسے ہی تُکا لگانے میں کیا حرج ہے؟ فلموں میں تو دیکھا ہی ہے۔ دبئی مال سے برج الخلیفہ کو راستہ جاتا ہے، اور بقول کسی کے میٹرو کے اندر سے ہی دبئی مال آ جاتا ہے۔ اب یہ ہمیں یاد نہیں رہا پوچھنے کا کہ کتنی دیر بعد آ جاتا ہے، کیونکہ ہم چلے جا رہے تھے اور چلے ہی جا رہے تھے۔ کسی سے پوچھتے تو وہ فرماتے کہ ہاں چلتے تو ٹھیک ہی جا رہے ہیں۔ کوئی دو کلو میٹر کا سفر طے کر کے دبئی مال کے آثار دکھائی دیئے، دبئی مال زیادہ وقت گزارنے کا من نہ کیا۔ ویسے بھی من برج الخلیفہ اور ڈانسنگ فاؤنٹین کی طرف تھا۔ برج الخلیفہ کو بھی چھوڑیں، ڈانسنگ گرل (فاؤنٹین) پہ دل اٹکا ہوا تھا۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ میں دبئی مال سے ہی ڈانس کرتا ہوا ڈانسنگ فاؤنٹین کے پاس جاؤں یہ گاتا ہوا" او بے بی او بے بی میری گل کیوں نہیں سن دی ای ای ای (ذرا عربی انداز میں گنگنائیں)"۔ ایسی فاؤنٹین پہلی بار دیکھی جو کمر لچکا لچکا اور کبھی مٹکا مٹکا کر عربی گانوں کی دھن پہ ناچ رہی تھی۔ ڈانسنگ فاؤنٹین کافی دیر عربی گانوں اور ایک آدھ انگلش گانے پر رقص کرتی رہی۔ برج الخلیفہ کو دیکھ کر لگا کہ فقط ایفل ٹاور ہی ایفل ٹاور نہیں برج الخلیفہ بھی برج الخلیفہ ہی ہے۔

رات دیر سے ہوٹل پہنچے، بوفے ڈنر ابھی تک چل رہا تھا، ہم نیند سے نڈھال ہو چکے تھے۔ میں نے بیگم سے پوچھا کہ تھوڑا سا ڈنر ہو جائے، اُس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ" توں کی چیز واں؟"۔ سوتے ہوئے سوچا کہ صبح جلدی نہ اٹھوں، فلائیٹ کا ٹائم گزر جائے تو صبح اٹھ کر ہوٹل میں شور مچا دوں کہ میری فلائیٹ مس ہو گئی میری فلائیٹ مس ہو گئی (چھبیس گھنٹے مزید مل جائیں گے)۔

نسلوں کے دکھ

محمد ادریس لاہوری

آج شرفو نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے دوست سے ضرور بات کرے گا۔ اس کا بچپن کا دوست طافا مقامی قبرستان میں گورکن تھا۔ وہ اور طافا اکٹھے کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ ماں باپ نے اس کا نام الطاف رکھا تھا مگر وہ طافے کے نام سے مشہور تھا۔ طافے کا باپ بھی گورکن تھا۔ اسی طرح شرفو کا اصل نام شریف تھا۔ مگر اس کے ماں باپ اسے شرفو کہہ کر بلاتے تھے۔ شرفو کے ماں باپ مقامی زمیندار کے ملازم تھے۔ اس کا باپ زمیندار کے کھیتوں میں کام کرتا اور اس کی ماں زمیندار کے گھر کے کام کاج کرتی تھی۔ فصل کٹنے کے بعد اسے سال بھر کا گیہوں مل جاتا تھا اور زمیندار کی بیوی انہیں گھر کے پرانے کپڑے دے دیا کرتی تھی۔ جس سے وہ تن ڈھانپ لیتے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ شرفو اور طافا بھی جوان ہو گئے تھے۔ غربت کے باعث وہ دونوں دوست پڑھ نہ سکے تھے۔ لہٰذا اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہی کاموں میں جت گئے جن میں انہیں حالات نے لگا دیا تھا۔ شرفو کے ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر تھی اس کے چچا کی بیٹی حنیفاں بھی جوان تھی۔ اس کے ماں باپ نے زمیندار سے کچھ رقم قرض لے کر شرفو کی شادی بھائی کی بیٹی حنیفاں سے کر دی۔

شرفو کی بیوی حنیفاں اگرچہ غربت میں پلی تھی مگر غیر معمولی حُسن کی مالک تھی جو بھی اسے دیکھتا دنگ رہ جاتا۔ شرفو بھی اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔

ایک دن اس کے باپ کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے سانپ نے ڈس لیا اور اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ شرفو کو باپ کے مرنے کا بہت دکھ ہوا۔ اب گھر کی تمام ذمہ داریاں اس پر آن پڑی تھیں۔ اس نے کھیتوں پر کام کے علاوہ دوسری جگہ مزدوری بھی شروع کر دی تھی۔ تاکہ گھر کے حالات بہتر ہوں اور قرض بھی اُتارا جا سکے۔ زمیندار کی بیوی خدا ترس تھی۔ اس نے لوگوں کو اپنی ہی زمینوں پر ایک چھوٹا سا گھر بھی رہنے کو دیا ہوا تھا۔ شرفو کی ماں اب بوڑھی ہو گئی تھی اس لیے مددگار کے طور پر اپنی بہو کو ساتھ لے جانے لگی تھی۔ وہ دونوں ہی حویلی کے سارے کام کاج کرتی تھیں۔ حنیفاں کبھی کبھار اپنی قسمت کو روتی کہ ماں باپ کے گھر بھی غربت دیکھی ہے اور اب شوہر کے گھر بھی غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ مگر پھر صبر کر جاتی تھی کہ کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ شرفو اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کا خیال بھی رکھتا تھا جلد ہی وہ اُمید سے ہو گئی۔

ایک دن وہ زمیندار کے بیٹے کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی کہ اس کا بیٹا آ گیا۔ اپنے ہی کمرے میں بے بس اور بے مثال حُسن دیکھتے ہی اس کے اندر کا درندہ باہر آ نکلا۔ اس نے جھپٹ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور اس سے پہلے کہ شکاری کے نرغے میں آئی ہرنی کو خطرے کا اندازہ ہوتا وحشت کا خونریز رقص شروع ہو گیا۔ لٹی پٹی حنیفاں آنسو پونچھتی گھر پہنچی۔ اب اس نے زمیندار کے گھر کام کرنے سے انکار کر دیا۔ زمیندار کے لڑکے نے ان پر چوری کا الزام لگا کر کام سے اور بعدازاں گھر سے بھی بے دخل کر دیا۔ شرفو نے گاؤں ہی میں ایک چھوٹا سا گھر کرایہ پر لے لیا اور وہاں رہنے لگے۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے قریبی قصبے میں جا کر ایک سیٹھ کی دوکان پر محنت مزدوری شروع کر دی۔ اسے روزانہ 100 روپے مزدوری ملتی تھی۔ دوپہر کا کھانا تمام مزدور قریبی ریسٹورنٹ سے کھاتے جہاں سیٹھ صاحب نے 25 روپے فی مزدور ٹھیکہ کر رکھا تھا۔ جس کا بل سیٹھ صاحب دیا کرتے تھے۔

اللہ نے شرفو کو ایک بے حد خوبصورت بیٹی سے نوازا۔ بیٹی کو پا کر شرفو کھل اُٹھا۔ مگر ماں گڈو کو دنیا میں لانے کی اذیت ناک جدوجہد میں دنیا سے چل بسی۔ اس نے بیٹی کا نام اللہ رکھی رکھا۔ مگر وہ اسے پیار سے گڈو کہتا تھا۔

شرفو اپنی محدود آمدنی کے باعث گھر والوں کی ضرورتیں پوری نہ کر سکتا تھا۔ وقت اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ گڈو پر بھی ماہ و سال اثرانداز ہونے لگے۔ وہ اب باتیں کرنے لگی تھی اور سارا دن گھر کے آنگن میں دوڑتی پھرتی۔ شکل وصورت ماں کی طرح خوبصورت تھی۔ گڈو باپ کی آنکھ کا تارا تھی۔ شرفو گڈو کو بہت پیار کرتا تھا۔ مگر غربت کے باعث اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں بھی پوری نہ کر سکتا تھا جس کا اسے ہمیشہ ملال رہا۔ گڈو 6 سال

ئی ہوئی تو اسے مقامی اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ دو تین سال اور گزر گئے۔ گڈو پڑھائی میں بھی تیز نکلی اور کلاس میں اچھے نمبر لیتی رہی۔ عید آئی تو پچھلی کئی عیدوں کی طرح اس نے اس عید پر بھی باپ سے نئے زرد رنگ کے کپڑوں، مہندی اور چوڑیوں کی فرمائش کر ڈالی۔ شرفو شرمندہ ہوا کیونکہ وہ پچھلے 3 سالوں سے ہر آنے والی عید پر کپڑے وغیرہ کا وعدہ کرتا تھا۔ اس بار اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ گڈو کو اس کی پسند کے زرد رنگ کا سوٹ مہندی اور چوڑیاں ضرور لا کر دے گا۔ اس لیے وہ اپنے دوست طافے کے پاس مدد کے لیے قبرستان گیا اور اپنی مجبوری بتائی۔ طافا مالی مدد تو نہ کرسکا مگر اسے کہنے لگا دیکھ شرفو جو لوگ مردے کو دفنانے آتے ہیں وہ قبر کے اوپر سفید لٹھے کی چادر بھی ڈال جاتے ہیں۔ میرے پاس تین چادریں جمع ہیں۔ وہ تم لے جاؤ اور گڈی کا سوٹ سلوا لو مگر کسی کو بتانا نہیں۔ کفن کی چادروں کا سُن کر شرفو نے جھرجھری لی اور کانپ اُٹھا۔ مگر بیٹی کی محبت میں انکار نہ کرسکا۔ اس نے چادریں لیں اور درزی کے پاس پہنچا اور گڈو کا سوٹ سینے کو کہا۔ درزی نے سو روپے مانگے جو اس کے پاس نہیں تھے۔ اس نے کل حساب لگایا تو اسے 200 روپوں کی ضرورت تھی۔ 100 روپے درزی کے اور اور 50،50 روپے مہندی اور چوڑیوں کے۔ اب رہا مسئلہ سوٹ کے رنگ کا تو اسے رنگریز نے کہا کہ سیٹھ صاحب کے گھر شادی ہے اور میں نے کافی سارے سوٹوں کو پیلا رنگ دینا ہے۔ میں گڈو کے کپڑے مفت رنگ دیتا ہوں مگر بڑا مسئلہ 200 روپے کا تھا۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ ریسٹورنٹ والے کو کہا کہ سیٹھ صاحب اسے 25 روپے فی مزدور کھانے کا اسے دیتے ہیں اگر وہ مجھے 200 روپے دے دے تو میں 8 دن کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس طرح اس کی رقم پوری ہو جائے گی اور میری ضرورت بھی۔ ریسٹورنٹ والا مان گیا اور اسے 200 روپے دے دیے۔ یوں اس کی ضرورت پوری ہوگئی۔ عید سے دو دن پہلے اسے درزی نے کپڑے سی دیے۔ وہ کپڑے چوڑیاں اور مہندی لے کر خوشی خوشی گھر کی طرف چل پڑا۔ تصور ہی تصور میں وہ گڈو کو ان خوبصورت کپڑوں میں ملبوس دیکھ رہا تھا اور اس نے دیکھا گڈو کے ہاتھوں میں چوڑیاں اور مہندی خوب جچ رہی تھی۔ وہ خوشی سے نہال تھا اور اس تصور سے سرشار وہ گھر کی جانب رواں دواں تھا کہ اسے محلے کے ایک کونے کھڑے چند لوگوں کی سرگوشیاں سنائی دیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ نہ جانے کس ظالم درندے نے اس معصوم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر گلا گھونٹ دیا ہے۔ وہ سوچنے لگا آج پھر کوئی بیچاری کسی کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ اسے بے حد دکھ ہوا۔ جیسے ہی وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا وہاں عورتوں کا ہجوم دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ تیزی سے اندر کی جانب لپکا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی معصوم گڈو دادی کے بوڑھے ہاتھوں میں خون سے لت پت پڑی ہے اور اس کی بے جان کھلی آنکھیں دروازے کی طرف ہیں اور اپنے باپ کا انتظار کر رہی ہیں اور پوچھ رہی ہیں بابا میرے عید کے کپڑے مہندی اور چوڑیاں کہاں ہیں۔

شاعری/ممتاز راشد لاہوری

زندگی

زندگی دو طرح کی ہوتی ہے
یا تو ایسی کہ جس کی حسرت ہو
یا پھر ایسی کہ جس سے نفرت ہو

شاعری

شاعری دو طرح کی ہوتی ہے
یا تو ایسی کہ جیسی ''اُن'' کی تھی
یا پھر ایسی کہ جیسی ''اِن'' کی ہے

کھوپڑی

کھوپڑی دو طرح کی ہوتی ہے
ایک ایسی کہ مغز ہو جس میں
دوسری آپ خود سمجھ لیجے

قطعات

دل کو بوجھل کر دیتی ہیں
پل میں جل تھل کر دیتی ہیں
یادوں کی سفاکی توبہ
یادیں پاگل کر دیتی ہیں

....

بات ایسے نہ کیجیے ہم سے
اس طرح فیصلہ نہیں ہوتا
آپ کیوں ہم پہ طنز کرتے ہیں
آپ کے گھر میں کیا نہیں ہوتا

....

میرے شوقِ مصوری کے لیے
اُس نے جب رُخ کو بے نقاب کیا
عارض و لب بھی خوب تھے لیکن
میں نے آنکھوں کا انتخاب کیا

....

توراجا (انڈونیشیا)

سعدیہ بتول/راولپنڈی

انڈونیشیا کے صوبے سلیواسی کے ایک پہاڑی علاقے میں توراجا نامی قبیلہ آباد ہے۔ اس کی آبادی قریباً گیارہ لاکھ ہے۔ یہاں کے باشندے پہلے صرف اپنے قدیم مذہب کے پیروکار تھے۔ انیسویں صدی میں عیسائی مشنریوں کی کوششوں سے یہاں کے لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ اب یہاں کے کچھ لوگ عیسائی کچھ مسلمان اور کچھ لوگ اپنے مقامی مذہب کے پابند ہیں جسے الوک (ALUK) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ الوک صرف مذہب نہیں ہے بلکہ بیک وقت قانون ،مذہب اور روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کے لوگ یوں بھی مذہب سے زیادہ اپنی قدیم روایات کو اہمیت دیتے ہیں۔ توراجا کے لوگ مخصوص طرز تعمیر ،نقاشی اور تدفین کی منفرد رسومات کے سبب معروف ہیں۔ ان لوگوں کے ایک خاص طرز کے تعمیر کردہ گھروں کو ٹانگ کونان (TANGKONAN) کہتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق پہلا ٹانگ کونان جنت میں تیار کیا گیا تھا جو چار لکڑی کے پایوں پہ کھڑا تھا اور اس کی چھت کپڑے کی تھی۔ ان کے خیال میں ان کے آباء و اجداد جنت سے سیڑھیاں لگا کر زمین پر اتر آئے تھے اور انہوں نے جنت کے ٹانگ کونان کی مانند زمین پر بھی گھر بنا لیے۔ اس طرز کے گھروں کو مذہبی عقیدت اور احترام حاصل ہے۔ اس اونچے لکڑی کے ڈنڈوں کی مدد سے بنایا جاتا ہے۔ اس کی چھت بانسوں سے بنی ہوتی ہے اور اس کی شکل یوں ہوتی ہے گویا کمان الٹی دھری ہو۔ زرد، سرخ اور کالے رنگوں سے اس کے درو دیوار کو سجایا جاتا ہے اور اس کی لکڑی پر کھرچ کر نقش ونگار بنائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ نقاشی میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہ ایک آرائشی فن ہے جس کا مقصد اشیاء کے حسن کو دو چند کرنا ہے۔ یہ لوگ لکڑی پر مختلف بیل بوٹے بناتے ہیں اور اس کی مدد سے اپنے درو دیوار، ہتھیاروں اور زیورات کو دیدہ ذیب بناتے ہیں۔ یہ نقش عموماً جانوروں اور پودوں کی تصاویر یا پھر ہندسی اشکال پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی مقامی زبان تانا توراجا کے نام سے جانی جاتی ہے البتہ سرکاری زبان انڈونیشی ہی ہے۔ ان کی معیشت کا انحصار زراعت اور مویشی پالنے پر ہے۔ چاول، مکئی اور ات کھٹ ان کی قابل ذکر فصلیں ہیں۔ مرغ بانی، بھینس اور سور پالنا بھی ان کی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ یہاں کے باشندے مختلف تیلوں اور کافی کی کاشت سے بھی زر مبادلہ کماتے ہیں۔ بیسویں صدی سے قبل یہ قبیلہ دنیا سے لاتعلق اور گمنام تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں عیسائی مشنریوں کی آمد نے اس کا تعلق دنیا سے قائم کیا۔ انہوں نے یہاں کے لوگوں کو عیسائیت کی طرف راغب کیا۔ 1971ء میں قریباً پچاس یورپی باشندوں نے یہاں کا دورہ کیا۔ توراجا کے لوگوں کی تدفین کی رسومات خاصی منفرد اور حیران کن ہیں چنانچہ یہ بات سیاحوں کی توجہ کا باعث بنی اور 1972ء میں قریباً چار سو افراد نے توراجا کی تدفین کی رسم کا نظارہ کیا اور اس تقریب کی ویڈیو بنا کر مختلف ممالک میں نیشنل جیوگرافک پہ دکھائی۔ یہ اس قبیلے کی ایک اہم شخصیت کی تدفین کی تقریب تھی جو بہت تزک و اہتمام سے منعقد کی گئی تھی۔ یوں اس قبیلے کی شہرت پوری دنیا میں پھیل گئی۔ لوگ ان کی عجیب وغریب رسومات دیکھنے کیلئے یہاں کا رخ کرنے لگے اور تا راجا بالی کے بعد انڈونیشیا کا دوسرا اہم سیاحتی مقام بن گیا۔ توراجا قبیلے میں تدفین کی رسم بہت مہنگی اور منفرد ہوتی ہے۔ جتنا کوئی امیر اور بااختیار ہوگا اس کی تدفین اتنی ہی زبردست ہوگی۔ امیر لوگ میت کو ٹانگ کونان میں مصالحہ لگا کر رکھ دیتے ہیں تاکہ نعش خراب نہ ہو کیونکہ اس کو سپرد خاک کرنے میں کئی ہفتے یا مہینے لگ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ لوگ ایک وسیع دعوت کا اہتمام کرتے ہیں جو ہفتوں جاری رہتی ہے اور اس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ جس جگہ لوگوں کو جمع کیا جاتا ہے اس جگہ کو رانتے (RANTE) کہتے ہیں۔ یہ میدان گھاس سے ڈھکا ہوتا ہے۔ قیام کرنے والوں کیلئے چاول سے کوٹھیاں اور دیگر سہولیات مہیا کی جاتی ہیں۔ اس موقع پر ناچ گانے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ یہ اس طرح اپنے غم کا اظہار کرتے ہیں اور مرحوم کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ ان کے روایتی آلات موسیقی میں ایک بانس کی بنی ہوئی بانسری، کھجور کے

پتوں سے تیار کردہ ایک آلہ موسیقی اور ایک ہاتھ سے بجایا جانے والا باجا شامل ہے۔ مرد ایک ہجوم کی صورت دائرے میں رقص کرتے ہیں اور ماتمی گیت گاتے ہیں بعض اوقات ناچتے ہوئے یہ لوگ ہاتھوں میں تلواریں ڈھال یا پھر بھینس کا سینگ اٹھائے ہوتے ہیں تو کبھی انہوں نے ہیلمٹ پہن رکھے ہوتے ہیں۔ تدفین کے علاوہ فصل کی کٹائی، چاول اکٹھے کرنے اور جنگوں کے موقع پر بھی اپنے جذبات کا اظہار رقص سے کرتے ہیں۔ میت کے موقع پر رونا دھونا اور بین کرنا بھی ان کی روایت میں شامل ہے۔ تدفین کی تقریب مہینوں بلکہ بعض اوقات سال بھر جاری رہتی ہے۔ ان کے خیال میں موت یکدم واقع نہیں ہو جاتی بلکہ یہ ایک مرحلہ وار عمل ہے چنانچہ یہ مردے کو کپڑے کی مختلف تہوں میں لپیٹ کر ٹانگ کونان میں رکھ دیتے ہیں اور ان کے خیال میں مردے کی روح تب تک گاؤں میں گھومتی رہتی ہے جب تک ماتمی تقریب جاری رہتی ہے۔ یہ لوگ جب تک اسے سپرد خاک نہیں کر دیتے اسے زندہ ہی تصور کرتے ہیں۔ اس کے سامنے تینوں وقت کا کھانا لا کر رکھتے ہیں اسے کپڑے بدلواتے ہیں حتیٰ کہ رات کو اس کے کمرے کی بتی بھی نہیں بجھاتے۔ اسے مردہ نہیں کہتے بلکہ بیمار کہتے ہیں۔ مردے کو دفن کرنے کے تین طریقے رائج ہیں۔ تابوت کو پتھروں سے بنی قبر میں رکھا جاتا ہے، کسی اونچی چٹان سے لٹکا دیا جاتا ہے یا پھر کوئی بڑی غار اس غرض سے تلاش کر لی جاتی ہے جس میں تابوت کو رکھ دیا جاتا ہے۔ امیر لوگوں کو عموماً چٹانوں کو کاٹ کر پتھروں سے بنی قبر میں دفن کیا جاتا ہے جس کی تیاری میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں اور اس پر بہت لاگت آتی ہے۔ بچوں کے تابوت عموماً چٹانوں یا اونچے درختوں سے رسیوں کی مدد سے لٹکا دیئے جاتے ہیں اور یہ تب تک بندھی رہتی ہیں جب تک سالوں کی دھوپ اور بارش انہیں کمزور نہ کر دے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ سپرد خاک کر دینے کے بعد مردے کی روح پویا (PUYA) میں چلی جاتی ہے اور دیگر روحوں کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ تدفین کی دوسری اہم رسم بھینسوں کی قربانی ہے کیونکہ ان کے مطابق مرحوم کی روح کو پویا تک پہنچانے میں بھینس سواری کا کام دیتی ہے اور اس کے سفر آخرت کو آسان بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جتنا امیر اور صاحب اقتدار شخص مرتا ہے اتنی ہی زیادہ بھینسیں قربان کی جاتی ہیں۔ دسیوں بھینسیں اور سینکڑوں سؤر مار کر شاندار ضیافت تیار کی جاتی ہے۔ اس موقع پر مرغوں کی لڑائی کو بھی ایک مقدس عمل کے طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ ہر سال اگست کے مہینے میں توراجا کے لوگ مانینی (MANENE) کی رسم ادا کرتے ہیں۔ جس میں مدفون لاشوں کو از سر نو قبروں سے نکال کر گھر لے جاتے ہیں انہیں نہلا دھلا کر اچھے کپڑے پہنا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ کھڑے ہو کر تصاویر بنواتے ہیں۔ امیر لوگ تو اپنے مردوں کی آرائش کیلئے پارلر کی مدد بھی لیتے ہیں۔ اس موقع پر مردے کے بیٹے بیٹیاں اور دیگر اقرباء جمع ہوتے ہیں۔ اس رسم کے موقع پر بھی بھینسے بھینس کے گوشت سے ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم مردوں سے نہیں ڈرتے بلکہ یہ ہماری اپنے بڑوں سے عقیدت اور محبت کا اظہار ہے۔ اس تقریب کو جشن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کی موت جس جگہ واقع ہوئی ہو اس کو سال بعد اس مقام کی زیارت کرانا ضروری ہے ورنہ اس کی روح تکلیف میں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ توراجا کے لوگ دور دراز سفر کرنے سے ہمیشہ اجتناب کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر دور کسی علاقے میں ان کی موت واقع ہو جائے تو اہل خانہ کیلئے ہر سال مردے کی ممی کو اس جگہ لے جانا دشوار ہوگا۔ اس لیے یہ لوگ اپنے علاقے میں ہی رہتے ہیں خصوصاً بڑھاپے میں دور دراز کے سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ مردے کو تابوت سے نکالتے ہیں تو تمام اہل خانہ انہیں 'نیا سال مبارک کہتے ہیں'۔ ان مردوں کو پرانا مسالا ہٹا کر نیا لگایا جاتا ہے۔ تابوتوں کی مرمت کی جاتی ہے یا نئے تابوت میں دفن کیا جاتا ہے۔ میت کو جس مسالا لگے کپڑے میں لپیٹا جاتا ہے اس میں ایک درخت کے پتے بھی رکھے جاتے ہیں۔ صاحب ثروت افراد مردوں کو چلا کر دکھانے کیلئے شعبدہ بازوں کو بھاری رقوم ادا کرتے ہیں۔ توراجا دنیا کا واحد علاقہ ہے جہاں ہر سال کئی برس پرانی لاشوں کو لوگ پیروں پر چلتا دیکھتے ہیں۔ نیو یارک یارک نیوز نے اپنی ویب سائٹ پر ایک ایسی ویڈیو اپ لوڈ کی ہے جس میں 80 برس پہلے فوت ہونے والے پیٹر سامبی سامبارا نامی شخص کی لاش کو اپنے پیروں پر چلتا دیکھا جا سکتا ہے۔

اٹلی میں مقیم نامور ادیب، شاعر اور ناول نگار جیم فے غوری سے لبنیٰ صفدر کی گفتگو

ارژنگ: آپ کا پورا نام اور ادبی نام؟

جیم فے غوری: جس دن میں پیدا ہوا اس دن کی مناسبت سے میرا نام رکھا گیا، پچیس دسمبر (۲۵) کو شروع ہوئے ابھی پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی اس دن کرسمس کی عبادت کے بعد ایک اٹالین پریسٹ ہمارے گھر تشریف لائے اور اس اہم دن کی مناسبت سے اردو میں یوسف اور انگریزی میں جوزف کہہ کر مجھے بلایا یہاں پر نام ختم نہیں ہوا اس کے ساتھ والد کا نام جوڑا گیا اور اس کے آگے ذات کا نام غوری بھی لگایا گیا میں نے ہائی سکول میں کہانی لکھنی شروع کی اور کالج میں جا کر نظم کہنی شروع کی ایک بار نذیر قیصر نے اپنے ادبی رسالہ نقطہ نظر میں جو اس وقت وہ ملتان سے نکالتے تھے اور میری ایک نظم شائع کی اور میرے انگریزی اور اردو نام کو مکمل اردو میں جیم فے غوری لکھا تب سے میرا ادبی نام یہی ہے۔

ارژنگ: اپنے آباو اجداد کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جیم فے غوری: افغانستان کے علاقے غور سے ہماری نسل کا تعلق ہے گیارہویں صدی میں بادشاہ محمد غوری کے ساتھ اس کی فوج میں اہم خدمات سرانجام دیتے ہوئے جب لاہور سے ہوتے ہوئے بغاوتوں اور ریاستی معاملات درست کرنے کے بعد میرے آباؤ اجداد واپس جا رہے تھے تو دریا جہلم کے کنارے پڑاؤ ڈالا گیا وہاں ایک خفیہ حملے میں بادشاہ کو قتل کر دیا گیا اور بہت سے جاں نثار بھی مارے گئے۔ میرے آباؤ اجداد اپنی جان بچاتے ہوئے موجودہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں روپوش ہو گئے اور کچھ نے کوئٹہ کے راستے افغانستان واپسی کا راستہ اختیار کیا مگر وسائل اور نامساعد حالات کی وجہ سے وہاں پر ہی رک گئے کوئٹہ میں صدیوں رہتے گزر گئے مگر ہجرت کا سفر ابھی باقی تھا۔ کوئٹہ شہر میں جب انیس سو پینتیس ۱۹۳۵ء میں زلزلے نے تباہی پھیلائی تو میرے دادا اور والدین سیالکوٹ ہجرت کر گئے وہاں انیس سو چھپن ۱۹۵۶ء میں میری پیدائش ہوئی وہاں ابھی میں سینٹ انتھونی ہائی سکول میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا کہ انڈیا اور پاکستان کی سن انیس سو پینسٹھ، ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہوگئی جس میں میرے والد کے ماموں اور تین قریبی رشتہ دار انڈین توپ خانے کی بھینٹ چڑھ گئے ایک بار پھر ہم نے اس وقت کے لائل پور کی طرف ہجرت کی وہاں سن انیس سو اکیاسی ۱۹۸۱ء میں میری شادی ہوئی میری تین بیٹیاں تمثیل، تخلیق، زرین اور جوناتھن فیصل آباد میں پیدا ہوئے، اور ہاں سے سن انیس سو اٹھاسی ۱۹۸۸ء میں یورپ کی طرف ہجرت کی اور مستقل طور پر اٹلی کو اپنا دوسرا گھر بنایا، اٹلی کے شمال میں ایک چھوٹے کم آبادی والے شہر فیدنسا میں بال بچوں کے ساتھ مستقل طور پر آباد ہوں میرا اس بار ہجرت کرنے کا سبب پاکستان میں خوف کی فضا اور مذہب کی آڑ میں انسان کی تذلیل اور بے حرمتی تھی مذہب کی وجہ سے آزادی اظہار رائے بھی متاثر ہوئی ہے اور سیاسی و معاشی ناہمواری کی پیچیدگیاں میں ہوا،

پرائمری تعلیم فیصل آباد میں مکمل کرنے کے بعد فاطمہ بورڈنگ ہاؤس سے منسلک سینٹ البرٹ ہائی سکول گوجرہ سے میٹرک پاس کیا بورڈنگ ہاؤس کی چھوٹی سی لائبریری سے میں نے ٹارزن، بونوں کی دنیا، روبنسن کروسو اور ایلس ان ونڈر لینڈ کے علاوہ علی بابا چالیس چور اور ڈانیل ڈیفیو کو پڑھا اور میٹرک کے اردو نصاب میں شامل غالب، میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی کی شاعری پڑھی۔ فیصل آباد کے یونیورسٹی گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ریاض مجید کو سننے اور ان کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا ان دنوں نذیر قیصر سے بھی ملاقات ہوئی ان کی شاعری پڑھنے اور ان کو یوتھ پروگراموں میں سننے کا موقع ملا، کالج میں آرٹ کونسل میں منعقد ہونے والی ادبی محفلیں اور خاص طور پر مشاعرے بڑے شوق سے سننے جاتا، انجم سلیمی سے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں ملاقات ہوتی، میں نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن اردو ایڈوانس اور صحافت کے ساتھ پاس کی، نصاب میں شامل علم عروض کا مطالعہ کیا تو اس میں دلچسپی زیادہ ہوگی اس وقت میری لائبریری میں سو سال پہلے علم

عروض پر لکھی جانے والی کتب اصلی حالت میں موجود ہیں۔

اردو شعراء کے ساتھ انگریزی شعر اور ڈزورتھ، ولیم بلیک اور جان کیسٹس جیسے نامور شعراء کو بھی پڑھنے کا موقع ملا، جب مجھے حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے اٹلی ہجرت کرنی پڑی تو وہاں سے پرائیویٹ یونیورسٹی سے چار سال میں فلسفہ کی ڈگری حاصل کی وہاں عظیم فلاسفر رینے، ڈیکارٹ، ہیگل اور نطشے کا مطالعہ کیا اٹلی کے شہر میلان میں مجھے ویٹو سیلرنو کی قربت کا موقع ملا ان سے میری قربت اس لیے بھی زیادہ تھی کہ وہ اردو زبان پر عبور رکھتے تھے انہوں نے علامہ اقبال کی بالِ جبریل اور بانگ درا کے علاوہ مستنصر میر کی اقبال کا بھی اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ہے سن انیس سودس ۱۹۱۰ء میں ساکواہ اور سمواہ اردو ادبی تنظیموں (جن کا میں بانی چیئر پرسن ہوں) کی طرف سے سالانہ منعقد ہونے والے اردو ادبی سیمینار میں پروفیسر ویٹو نے علامہ اقبال پر ایک طویل مقالہ پڑھا تھا اس سال بھی اگست کے دوسرے ہفتہ میں منعقد ہونے والے اردو سیمینار میں جناب حسن عباسی کے علاوہ پوری دنیا سے نامور ادیب و شاعر اور دانشور شرکت کر رہے ہیں۔

ارژنگ: آپ کا نظریہ شعر کیا ہے؟

جیم نے غوری: شعر باوزن اور بامعانی اور مروجہ بحور اور وضع کردہ اصولوں کے مطابق لکھی ہوئی سطر ہو، جس میں لکھنے والا اپنا تخیل استعمال کرتے ہوئے موضوع اور الفاظ استعمال کرے جو انسان اور اس سے جڑی ہوئی اشیاء کی ترقی و ترویج اور فلاح و بہبود کے ساتھ وابستہ ہو۔

ولیم ورڈز ورتھ نے کہا کہ شاعری طاقتور جذبات کی اچانک فراوانی ہے جو اپنی اصلی جذباتی حالت میں سکون و خاموشی میں جنم لیتی ہے، مغرب کے ناقدین کے وضع کردہ نظریہ شعر سے اردو زبان کے نظریہ شعر کے بارے میں کچھ کام کیا گیا ہے تاہم شعر کا تعلق سماج کے رسم و رواج اور انسانی جذبوں اور احساسات سے ہونا چاہیے سماج کی حالت ادب کا آئینہ ہوتا ہے اور ادب کا آئینہ سماج ہو سکتا ہے خیال کی سچائی کو سماجی ساخت پر پرکھا جاتا ہے خیال سماجی معروضیت کا حصہ ہوتا ہے اور معروضی مادی حقیقت شاعر و ادیب اور نقاد فلسفی پر اثر انداز ہوتی ہے سماجی اور معروضی صورتحال ہی خیالات کو جنم دیتی ہے اردو ادب میں شعر کو تھوڑا رائز کرنے میں ابھی وقت لگے گا کیونکہ ابھی اردو نقاد و ادیب نظریہ شعر پر متفق ہونے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے کیونکہ ان کو موجودہ حالات میں محبت یا مذہب کو ایک ساتھ یا ان دونوں میں سے ایک کو منتخب کرنے بہت سی مشکلات کا سامنا ہے ہماری سوچ انسان، مذہب، ادب اور سماج کے بارے میں واضح نہیں ہے لہذا آج کے نقاد اور ادیب کا اردو میں نظریہ شعر کا خیال دھندلا سا ہے، ہمارے ہاں جدید علوم و افکار کو مذہب کے ساتھ لے کر چلنے کی بجائے مذہب کا زندگی میں ضرورت سے زیادہ بے جا عمل دخل بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے شاعر بہت احتیاط سے لکھتا یا پھر لکھتا ہی نہیں ہے کیونکہ خوف و ہراس اور افراتفری کے ماحول میں محبت کے جذبوں کی سچائی کا بیان کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں آزادی اظہار رائے پر قدغن کی وجہ سے سماجی، مذہبی اور ادبی ماحول میں وہ سب کچھ قابلِ سزا ہے جو شاعر لکھنا چاہتا ہے، نصاب میں ایک دوسرے کی عقائد اور مسالک کو نفرت انگیز طریقے سے نئی نسل کو پڑھایا جاتا ہے تاریخ کو مسخ کر کے اس میں خود کو سب سے اعلیٰ اور باقی تمام اقوام کو حقیر اور پست لکھتے ہیں ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں اپنے ہم مذہب کے ہر کام کو اس طرح فخریہ انداز میں دیکھتے ہیں کہ اپنی نسل کو انسانیت کے خلاف کام کرنے والے کو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں چاہے وہ کام پرامن دنیا کی تباہی و بربادی کا سبب ہے اور انسانیت کی اس میں تذلیل اور ہماری بدنامی کا سبب ہو، یوں میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں اردو میں تخلیق ہونے والی شاعری آنسوؤں کی مانند ریت میں جذب ہو رہی ہے۔

ادیب اپنے معاشرے کا قرض دار ہوتا ہے اور قرض کو وہ یوں اتار سکتا ہے کہ جس معاشرے میں وہ زندہ ہے اس کو امن، محبت اور انصاف کا پیغام دے اور اس جدید دور کی ادیب کو سچ لکھنے کی عادت ڈالنی پڑے گی اور جھوٹ کو سچ چھوڑنا پڑے گا دلائل اور حقائق کے ذریعے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کو قائل کرنا ہے تاکہ تشدد اور زبردستی سے اپنی بات منوانے کے طریقے اپناجے، آج نامساعد حالات میں ادیب کی ذمہ داریاں انتہائی نازک موڑ پر ہیں کیونکہ ہم نے اپنی نئی نسل کو ایسے طرزِ احساس اور فکر و خیال کا اثاثہ منتقل کرنا ہے جو

اپنی تہذیب وثقافت کی قدار کی حفاظت بھی کر سکے اور عالمی سطح پر درپیش چیلنجز کا سامنا بھی کر سکے ادیب کا ادب کے ساتھ ایمان دار ہونا ضروری ہے وہ تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہو اپنے اردگرد ماحول پر نظر رکھتے ہوئے لوگوں کو درپیش مسائل کے پائیدار اور مستقل حل کی تلاش میں رہے اور قابل اعتماد اور درست سمت کا تعین کرے۔

ارژنگ: آپ ادبی گروہ بندیوں کو ادب کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں یا مفید؟

جیم فے غوری: اگر تو انسانی رنگ ونسل اور امتیازی رویوں کی بنا پر ذات برادری یا مذہب یا پھر ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر گرہ بنائے جائیں تو یہ ادب کے لیے نا قابل برداشت ہیں کیونکہ ایسے میں جو ادب تخلیق ہوگا وہ کسی طرح مقامی یا بین الاقوامی سطح پر معیاری نہیں ہوگا اور اگر یہ ادب کی اصناف اور شعبوں پر مبنی ہیں تو ادب کی ترقی وترویج کے لیے سودمند ہیں۔

ارژنگ: آپ کی تنظیم کا نام اور کس طرح کے پروگرام منعقد کروا چکے ہیں آپ کی کتنی کتب اب تک شائع ہو چکی ہیں؟

جیم فے غوری: سن انیس سو چوراسی ۱۹۸۴ء میں فیصل آباد سے ساؤتھ ایشین کرسچن رائٹرز ایسوی ایشن کا آغاز ہو گیا تھا جب میں اٹلی آ گیا تو دو ہزار نو ۲۰۰۹ء میں ایک اور تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا نام ساؤتھ ایشین مینار ٹیز رائٹرز ایسوی ایشن ہے کیونکہ یورپ میں ہم برصغیر سے آئے ہوئے لوگ رنگ ونسل اور زبان وثقافت کی وجہ سے اقلیت میں ہیں اس لیے اس تنظیم کی اشد ضرورت تھی ہم دو ہزار نو ۲۰۰۹ء سے سالانہ عالمی اردو زبان وادب پر چار روزہ کانفرنس اور سیمینار اپنی مدد آپ کے تحت کرواتے ہیں جس میں مشاعرے، مقالے، ثقافتی پروگرام اور ایشین موسیقی کے پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔ میرے اب تک چھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ایک ''نئی رت کے گیت'' کا مجموعہ گیتوں پر مشتمل ہے اور ایک اردو زبان میں ''خواب کی کشتی پر''، ''ماہیوں'' پر مشتمل مجموعہ ہے باقی مجموعوں کے نام ہیں، ''ہاتھ پر دیا رکھنا''، ''ندی میں اترتا ستارہ''، ''ستارہ ندی اور میں'' اور ''برگزیدہ حسین لوگ'' شامل ہیں اس کے علاوہ افسانوی مجموعے ''لاریب اور شطرنج لڑکی'' اور ''فالتو چیز'' ہی اور ایک طویل ناول'' ہم گمشدہ لوگ'' مکمل ہے جو اگلے دن شائع ہوگا کچھ کتب کے اردو میں تراجم کیے ہیں جو شائع ہو چکی ہیں ایک کتاب مسیحی مسلم رابطہ وقت کی اہم ضرورت بھی فیصل آباد سے شائع ہو چکی ہے۔

ارژنگ: مشاعرہ اردو ادب کی ترقی وترویج کے لیے کتنا اہم اور ضروری ہے؟

جیم فے غوری: مشاعرہ اردو شاعری کی ایک پرانی روایت ہے جس کا اردو شاعری کی ترقی میں اہم کردار ہے اس روایت کو قائم رہنا چاہیے مگر آج کل مشاعروں میں سنائے جانے والے شعری کلام کے خیال، موضوع اور الفاظ کے انتخاب کے علاوہ صنائع بدائع اور مروجہ بحور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ارژنگ: اٹلی کے حوالے سے اپنی یادوں کو ہمارے ساتھ شیئر کریں؟

جیم فے غوری: سن انیس سو چھیانوے ۱۹۹۶ء کا واقعہ ہے اٹلی میں آئے مجھے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اطالوی زبان بھی ابھی کوئی خاص نہیں آتی تھی ایک بار میں مقامی تھیٹر میں دانتے ایلگری کی ڈیوئن کامیڈی پر مبنی سٹیج ڈرامہ دیکھنے اکیلا ہی چلا گیا پورے ہال میں صرف اکیلا میں ہی برصغیر سے تھا ڈرامے کے کرداروں کی مجھے کچھ کچھ سمجھ آ گئی مگر اطالوی زبان کے مکالمے مجھے سمجھ نہ آئے ڈرامہ ختم ہو گیا تو ڈرامہ کا ڈائریکٹر مجھے برصغیر سے آیا ہوا سیاح سمجھ کر میرے پاس آ گیا اور مجھ سے سوال کیا کہ آپ کو ڈرامہ کیسا لگا ہے میں نے جواب میں کہا بہت اچھا تھا اور پھر میں نے اسے انگریزی میں ڈیوئن کامیڈی سنانی شروع کر دی کیونکہ میں پاکستان میں ڈیوئن کامیڈی پڑھ چکا تھا وہ بڑے دھیان اور انہماک سے سن رہا تھا اور بار بار سر کو جنبش یوں دے رہا تھا کہ جیسے ہر لفظ اسے سمجھ آ رہا ہے کہ چوکیدار کی آواز آئی کہ حضرات میں نے ہال بند کرنا ہے جب ہم ہال سے باہر آئے تو اس نے خدا حافظ کہنے سے پہلے مجھے کہا کہ مجھے انگریزی نہیں آتی اس لیے مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ آپ نے کیا کہا ہے مگر ایک بات میں آج سمجھ گیا ہوں کہ پاکستانی عالمی ادب کو پڑھنے اور اطالوی ادب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ارژنگ: زندگی کا کوئی یادگار واقعہ؟

جیم فے غوری: میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا سال میں تین مرتبہ گھر جانے کا موقع ملتا تھا یوں ماں اور بڑی بہن جمیلہ کے پاس رہنے کا بہت کم وقت ملتا تھا

کیونکہ ان دونوں سے میرا زیادہ پیار تھا اس بار جب میں گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا تو ماں بہت بیمار تھی ایک دن میں ان کی چارپائی کے قریب بیٹھا ہوا تھا کہ ماں نے مجھے کہا تمہارا باپ کہاں ہے میں نے جواب دیا کہ وہ دوسرے کمرے میں ہیں جلدی سے ان کو بلاؤ میں دوڑ کر گیا اور انہیں بلالیا ماں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے باپ سے کہا جو جے (گھر میں میرا لاڈ کا نام ہے) کا خیال رکھنا اور اس کے ساتھ ہی ماں کی سانس بند ہونا شروع ہوگئی اور آہستہ آہستہ اس کی جان نکل گئی میں نے اپنی ماں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا مگر اس کی سانس بحال نہ کر سکا چند منٹ کے بعد میں تیز بخار اور پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہوگیا اور ایک ہفتہ مجھے ہسپتال میں داخل رہنا پڑا، یوں ڈاکٹروں نے مجھے مرنے سے بچالیا ۔ دوسرا واقعہ میری بہن جمیل کا آگ میں جل کر مرنا تھا جو خاوند اور چار بچوں کے ساتھ خوش وخرم زندگی بسر کر رہی تھی اور ڈاکٹرز اس کو بچا نہ سکے دونوں واقعات آج بھی کبھی کبھار میری راتوں کی نیند اڑا دیتے ہیں اور مجھے بیوی بچوں سے بے خبر کر کے کسی اور دنیا میں گم کر دیتے ہیں۔

ارژنگ: سیاست سے دلچسپی ہے؟

جیم ـ فے غوری: ہاں بالکل ہے مگر ہو سیاست جو تشدد اور خوف سے پاک ہو صاف ستھری اور سچ، امن وانصاف اور محبت پر مبنی ہو۔

ارژنگ: محبت ایک بار ہوتی ہے یا ایک بار سے زیادہ ہوسکتی ہے؟

جیم ـ فے غوری: محبت ایک انمول جذبہ ہے جو خدا نے انسان کو تحفہ دیا ہے اگر آپ کی کائنات کی ہر چیز کو محبت سے دیکھنا شروع کردیں تو آپ کے مشاہدے میں آئے گا کہ ہر چیز خوبصورت ہے آپ کو احساس ہوگا کہ محبت وہ چیز نہیں ہے جو آپ کرتے ہیں بلکہ وہ ہے جو آپ محبت سے کرتے ہیں محبت تو ہوا کی طرح ہے جس کو آپ دیکھ نہیں دیکھ سکتے محسوس کر سکتے ہیں، افلاطون نے کہا کہ محبت کو جو چھو لیتا ہے وہ شاعر بن جاتا ہے، نطشے نے کہا کہ محبت میں ہر وقت پاگل پن موجود ہوتا ہے لیکن اس پاگل پن کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اور رنجش محبت کی حتمی شکل ہوتی ہے، محبت انسان کو بار بار اپنی گود میں لے لیتی ہے لیکن خاندان بنانے کے لیے محبت ایک بار ہی ہوتی ہے جو انسانی بقا کے لیے نہایت اہم ہے۔

ارژنگ: اٹلی میں اردو زبان وادب کی کیا صورتِ حال ہے؟

جیم ـ فے غوری: اٹلی میں اردو زبان کی بہت مخدوش حالت ہے لیکن ہم ابھی تک اردو کا دامن تھامے ہوئے ہیں لکھنے پڑھنے اور بولنے کے لیے اسی کا استعمال کرتے ہیں مگر صرف گھروں میں اور ہم وطنوں کے پروگراموں میں ۔ لیکن ہماری نسل بولنے اور سمجھنے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے پڑھنا اور لکھنا وہ بھول چکے ہیں اور ان کے بچے یعنی ہماری تیسری نسل اس کو کوئی اجنبی زبان کے طور پر لیتے ہیں چند فقرے اور الفاظ کے علاوہ کچھ نہیں جانتے، چند آن لائن اردو اخبار زبان کی خدمت کر رہے تھے اسی طرح اردو ادب کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں رضاء الحق اور ملک نصیر کے ساتھ دو تین لوگ ہیں جو سال میں ایک دو بار اپنی مدد آپ کے تحت مشاعرہ یا کسی نامور شخصیت کے اٹلی آنے پر پروگرام کر لیتے ہیں پورے اٹلی میں صرف تین دابی تنظیمیں ہیں حلقہ ادب و ثقافت پاکستان، ساکواہ اور سمواہ، جو اردو زبان کی اپنی مدد آپ کے تحت خدمت کر رہی ہیں حکومت پاکستان کو ایک واضح پالیسی کے تحت اٹلی میں پاکستان ایمبسی اور قونصل خانے کو فنڈز مہیا کرنا چاہیے جو اردو زبان وادب اور پاکستانی ثقافت کے لیے مختص ہیں۔

ارژنگ: یورپ میں کتاب کا مستقبل کیا ہے؟

جیم ـ فے غوری: جدید ٹیکنالوجی کے باوجود یورپ میں آج بھی کتاب کا مستقبل روشن ہے آج بھی زیادہ تر لوگ کتاب خرید کر پڑھتے ہیں بڑے تہواروں پر تحفے میں کتاب دینے کا رواج ہے آج بھی ایک کتاب کا یورپ میں بولی جانے والی کم از کم چار زبانوں میں ایڈیشن بیک وقت لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتا ہے لوگ فارغ وقت میں کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں سفر میں زیادہ تر لوگ کتاب کو ہم سفر رکھتے ہیں اور کتاب کا مصنف ایک کتاب کی اشاعت سے اتنے پیسے کما لیتا ہے کہ خوشحال زندگی بسر کرتا ہے۔

ارژنگ: ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام

جیم ـ فے غوری: ارژنگ میں پاکستانی ادبی وثقافتی حلقوں میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اردو ادب لکھنے اور پڑھنے والوں کا پسندیدہ میگزین بن چکا ہے اس کے قارئین سے صرف اتنا کہوں گا کہ انسان سے محبت کریں اپنے دلی ورثہ سے محبت کریں اور دنیا میں امن و امان اور انصاف کی حمایت کریں ۔ آخر میں حسن عباسی کی بے لوث محبت کا ہمیشہ قرض دار رہوں گا، بہت شکریہ

شاعری

اپنے اجداد کے قدموں ہی پہ چلنا ہے مجھے
دنیا جنت سہی جنت سے نکلنا ہے مجھے
میں نے جو پیڑ لگائے تھے وہ چھوٹے ہیں ابھی
اور کچھ دیر کڑی دھوپ میں جلنا ہے مجھے
جسم کی خیر مناؤں کہ بچاؤں سر کو
بارشِ سنگ ہے اور گھر سے نکلنا ہے مجھے
درد کی تیز ہوا دھوپ غموں کی سر پر
برف کی طرح لگاتار پگھلنا ہے مجھے
گرد آلود ہوا زہر سے معمور فضا
اور یہ جبر یہیں پھولنا پھلنا ہے مجھے
چاندنی رات ہو یا دن کا اُجالا نصرتؔ
عمر بھر اپنے ہی سائے سے بہلنا ہے مجھے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

اگرچہ تیرے سوا کچھ سجھائی دیتا نہیں
مگر کبھی کبھی تو بھی دکھائی دیتا نہیں
یہ سچ نہیں کہ تجھی کو سنائی دیتا نہیں
کبھی یہ شہر بھی مل کر دہائی دیتا نہیں
وہ کیسا مصلحت اندیش ہے خدا رکھے
جو بیٹا باپ کو اپنی کمائی دیتا نہیں
میں ایک وقت میں صیاد بھی ہوں صید بھی ہوں
میں اپنے آپ کو یوں بھی رہائی دیتا نہیں
وہ روشنی ہے کہ خیرہ ہے دیدۂ بینا
وہ تیرگی ہے کہ کچھ بھی سجھائی دیتا نہیں
ہوئی ہے اب مری بینائی اس قدر محدود
ترے سوا مجھے کچھ بھی دکھائی دیتا نہیں
تم اپنی آپ وکالت کرو گواہ بنو
یہاں تو کوئی کسی کی صفائی دیتا نہیں
اُسے پسند ہے یکتا و خود نگر رہنا
اسی لیے وہ کسی کو اکائی دیتا نہیں

نصرت صدیقی/فیصل آباد

اُداسیوں میں بھی مسکراؤ اے شہر والو!
کوئی تو جشنِ طرب مناؤ اے شہر والو
چلو کہ خوشیاں منا رہا ہے زمانہ سارا
چلو یہ بے چینیاں مٹاؤ اے شہر والو
کبھی کسی کو کوئی حقارت سے اب نہ دیکھے
محبتوں کی قسم اُٹھاؤ اے شہر والو
میں اپنے یاروں کی سازشوں میں گھرا ہوا ہوں
کسی طرح سے مجھے بچاؤ اے شہر والو
میں جن کی گلیوں میں چھوڑ آیا تھا اپنا بچپن
وہ لوگ کیسے ہیں کچھ بتاؤ اے شہر والو
اسدؔ حسینوں کو میرے جانے کا دکھ تو ہوگا
میں جا رہا ہوں گلے لگاؤ اے شہر والو

اسد اعوان/سرگودھا

کوئی محبوب ہوتا جا رہا ہے
یہ دل معتوب ہوتا جا رہا ہے
کسی نادیدنی خواہش کے ہاتھوں
بدن مصلوب ہوتا جا رہا ہے
ہوا کے نام لکھتی جا رہی ہوں
دیا منسوب ہوتا جا رہا ہے
یہ تنہائی کا وحشت ناک موسم
مجھے مرغوب ہوتا جا رہا ہے
قلم کی نوک پر حسرت کا تارا
مرا اسلوب ہوتا جا رہا ہے
کنولؔ ویران ہے خوابوں کا حجرہ
یہ دل مجذوب ہوتا جا رہا ہے

آسناتھ کنول/لاہور

ہم اُفق پار کہیں اک نئی جنت میں چلیں
کاٹ لی خوب سزا اب کسی جنت میں چلیں
ہے غمِ زیست سے بچنے کا طریقہ یہ بھی
نیند کے ساتھ حسیں خواب کی جنت میں چلیں
بند آنکھوں سے سفر خواب ہیں کرتے جائیں
تجربہ ہی سہی، افسانوی جنت میں چلیں
اپنی مرضی سے گزاریں کبھی دو دن ہم بھی
دولتِ زیست لیے معنوی جنت میں چلیں
راج ہو امن و محبت کی حکومت کا جہاں
ایسے جذبات سے مل کر بنی جنت میں چلیں
جنتوں کے تو کئی خواب نظر آتے رہے
اب حقیقت کی کسی اور ہی جنت میں چلیں
ابتدا میں جو سبیلہؔ تھا بشر کا مسکن
پاک خوشبو سے معطر اُسی جنت میں چلیں

سبیلہ انعام صدیقی

سحر ہونے کو ہے ہائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کوئی مضمون مل جائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
مجھے اس سلسلائے عشق کو آگے بڑھانا ہے
نہیں جو یار کہہ پائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
تری زُلفیں ترے چہرے لب و رخسار پر تیرے
اگر تو جلوہ فرمائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
مجھے اُکسا رہا ہے شاعری پر یہ حسیں موسم
درختوں کے گھنے سائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
سنو چھوٹا سا اب یہ کام کر کے آپ سو جائیں
بنا کر دیں مجھے چائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کہیں گم ہو گیا ہوں وادی حیرت کی وسعت میں
کوئی میری خبر لائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
میں اب یہ چاہتا ہوں آپ مجھ کو چھوڑ دیں تنہا
تو کیا ہے آپ کی رائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کسی کے پاس آنے سے مری تنہائی بٹتی ہے
کوئی اب پاس نہ آئے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں

عرفان اللہ عرفان/

سوچ لو ایسا نہ ہو پھر ہو ندامت بعد میں
یوں سمجھ لو پھر نہیں ملتی ہے مہلت بعد میں
درد سہتا ہے یہ دل پہلے کسی اُمید پر
اور ہو جاتی ہے پھر پختہ یہ عادت بعد میں
یوں کیا کرتے نہیں ہیں اجنبی پر اعتبار
یاد آئے گی تمہیں میری نصیحت بعد میں
اب تو پھر بھی ایک موقع دے رہا ہوں میں تمہیں
کچھ نہ ہوگا پھر، نہ کرنا تم شکایت بعد میں
اک قیامت آ چکی ہم پر ترے جانے کے بعد
کیا کریں گے اب جو آئے گی قیامت بعد میں
یاد آئے گا ندیم زندگی ہر موڑ پر
بات یہ پہلے سمجھ لو اور محبت بعد میں

ریاض ندیم نیازی/ساہیوال

پھول سے بچوں کو ناحق خون میں نہلائے گی
حرص و لالچ کی بلا انسانیت کھا جائے گی
رات کا پچھلا پہر بھی ہے اذیت آنکھ پر
کس طرح مانو سحر لے کر سکوں گھر آئے گی
رس چرا لے گا کلی کا بے وفا جوبن کا چور
اور تتلی بے بسی سے دیکھتی رہ جائے گی
بے وفا تھا کر گیا ہجرت وفا کے شہر سے
اے مری دیوانگی کب تک مجھے بہلائے گی
سب گھروں سے شادیانوں کی صدا گونجے گی پھر
فاختہ جب امن کی میرے نگر میں آئے گی
اس کی سانسوں سے کھلیں گے زرد شاخوں پر گلاب
روشنی اس کے بدن کی چاندنی کہلائے گی
جسم فانی ہے مٹے گا ہے یقیں شاہدؔ مجھے
شاعری میری مجھے لیکن امر کر جائے گی

ہمایوں پرویز شاہدؔ/لاہور

حلقۂ زُلف گرہ گیر میں آ جاتا ہے
لگتا ہے دل کسی زنجیر میں آ جاتا ہے
ایک غم سے میں نکلنے بھی نہیں پاتا ہوں
اور اک غم میری تقدیر میں آ جاتا ہے
دکھ سبھی اپنے چھپا لیتا ہوں دل میں لیکن
کرب کا ذائقہ تحریر میں آ جاتا ہے
نام لیتا نہیں عابدؔ وہ پلٹ جانے کا
جو کوئی عشق کی جاگیر میں آ جاتا ہے

عابد سیال/خیر پور ٹامے والی

پیش کرنے اُسی کو اپنی جان لے کر میں چلا
دل میں اک جذبات کا طوفان لے کر میں چلا
راستے آگاہ تھے میرے سفر کے شوق سے
ساتھ اپنے اپنی یہ پہچان لے کر میں چلا
پیار کا پیغام لے کر میں پھرا چاروں طرف
کب کسی سلطان کا فرمان لے کر میں چلا
دینے آیا تھا صفائی اپنی تیرے شہر میں
اپنے سر پر اور کچھ بہتان لے کر میں چلا
سرنگوں سب رند تھے پیر مغاں کے سامنے
میکدے سے بادۂ عرفان لے کر میں چلا
شہر جاناں کی طرف عابدؔ مرا جانا ہوا
حسرتیں کچھ دل ہی دل میں کچھ ارمان لے کر میں چلا

عابد سیال/خیر پور ٹامے والی

ہے تو یہ سانحہ پر نام کہانی دے دو
کر کے تحریر اسے خواب روانی دے دو
واں تو شدت کی ہی گرمی تھی جہاں کام کیا
جو بھی اجرت ہے میاں ہوگی مہربانی دے دو
یہ بھی فطرت ہے جوانی میں نہیں آتا خیال
'بعد' میں کہتے ہیں خدایا کہ جوانی دے دو
بستر مرگ پہ لیٹا ہوں نزع طاری ہے
اپنے ہاتھوں سے مجھے گھونٹ ہی پانی دے دو
کیسے ڈھونڈیں گے اندھیرے میں مکاں تیرا سحرؔ
یا تو اک دیپ یا کوئی اور نشانی دے دو

اسد رضا سحرؔ/جھنگ

ادبی خبریں/تقریبات

افضل احسن رندھاوا کی وفات

پنجابی زبان و ادب کے نامور ادیب، شاعر، کہانی نویس اور ناول نگار افضل احسن رندھاوا گزشتہ دنوں وفات پا گئے۔ ان کی وفات سے ادبی دنیا میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے ان کے تخلیقی اور ادبی کام کو مدتوں سراہا جائے گا۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' کی پوری ٹیم اس دکھ میں برابر کی شریک ہے اور ان کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

پہچان انٹرنیشنل اور لاہور ادبی فورم کے زیرِ اہتمام شاندار عالمی محفل مشاعرہ

پہچان انٹرنیشنل اور لاہور ادبی فورم کے زیرِ اہتمام مقامی ریسٹورنٹ میں شاندار محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت معروف شاعر اور ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر ایوب خاور نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں پرنس اقبال گورایہ (دبئی)، عامر بن علی (جاپان)، ریاض شاہد (بحرین)، آصف جاوید آسی (فرانس) تھے۔ یہ وہ احباب ہیں جو دیارِ غیر میں اردو ادب کی شمعیں اپنی سطح پر روشن کیے ہوئے ہیں۔ ایسے محبت کرنے والوں کے ہوتے ہماری قومی زبان اردو کو کوئی خطرہ لاحق نہیں اور جو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اگلی نسل تک اردو زبان نہیں پہنچ پا رہی، ایسے درد دل اور پاکستان سے محبت کرنے والوں نے ایسے خدشات کو ختم کر دیا ہے۔ اب ماشاءاللہ دیارِ غیر میں بھی ادبی سرگرمیاں ویسے ہی برپا ہو رہی ہیں جیسے پاکستان کے مختلف شہروں میں ادبی تنظیمیں سرگرمِ عمل ہیں۔ حسن عباسی اور افتخار شوکت خود بھی اچھے اور مقبول شاعر ہیں اور ان کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے۔ حسن عباسی تو باقاعدگی سے سال بھر مختلف ملکوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کے لیے جاتے رہتے ہیں۔ مشاعرے کی نظامت لبنیٰ صفدر (جنرل سیکرٹری پہچان) افتخار شوکت (چیئرمین لاہور ادبی فورم) حسن عباسی (چیئرمین پہچان انٹرنیشنل) نے مل جل کر کی جس کے سبب تقریب میں خوب رونق رہی۔ ملک کے ممتاز شعرا، عامر بن علی، حسن عباسی، ریاض شاہد، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، لبنیٰ صفدر، سعید احمد، افضل عاجز، غافر شہزاد، علی رضا، افتخار شوکت، عمرانہ مشتاق، آسناتھ کنول، فاخرہ انجم، زاہد محمود شمس و دیگر نے اس مشاعرہ میں شرکت کی۔ اس موقع پر پرنس اقبال گورایہ کو متحدہ عرب امارات میں ادب کے حوالے سے ان کی گراں قدر خدمات کے عوض ''سفیرِ ادب ایوارڈ'' بھی پیش کیا گیا۔ لاہور میں اس روز پاکستان کرکٹ لیگ اور ورلڈ الیون کے درمیان فائنل میچ بھی تھا کہ جس کے سبب رخشندہ نوید اور سلمان گیلانی شرکت نہ کر سکے۔ (بشکریہ اوصاف)

تقریب رونمائی

معروف کالم نگار عامر شہزاد صدیقی کے کالموں میں سچائی کا منفرد انداز ملتا ہے۔ ''اوراقِ زیست'' گزشتہ تصانیف کی طرح فکر و شعور و آگہی کا مرکز ثابت ہو گی۔ ان خیالات کا اظہار بزرگ دانشور، محقق، ادیب ڈاکٹر اسد اریب نے سول ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن، دانشور فورم ملتان اور حفیظ گھی اینڈ جنرل ملز شمع بناسپتی کے اشتراک سے معروف کالم نگار، اینکر پرسن، پریزینٹر، کمپیئر، سماجی رہنما عامر شہزاد صدیقی کی چوتھی تصنیف ''اوراقِ زیست'' کی تقریب رونمائی کے موقع پر صدارتی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقع پر مہمانانِ خصوصی سینئر سیاستدان مخدوم جاوید ہاشمی نے کہا کہ ملتان کی تاریخ عامر شہزاد کے اسلاف کے حسنِ خلق کے کارناموں سے مزین ہے۔ یہ اپنے اسلاف کی طرح اپنے قلم کے ذریعے مسائل کی نشاندہی کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس موقع پر پروفیسر حنیف چودھری، انجینئر ممتاز خان، رضی الدین رضی، شاکر حسین شاکر، ملک جہانزیب وارن، مسیح اللہ جام پوری نے بھی خطاب کرتے ہوئے عامر شہزاد کو ادبی اور سماجی میدان کا اثاثہ قرار دیا۔ مہمان اعزاز زاہد حسین گردیزی، اظہر سلیم مجوکہ، اعظم خان خاکوانی، انجینئر امجد فاروق، خواجہ محمد فاروق، وسیم ممتاز ایڈووکیٹ، استاد اللہ بخش، رانا فراز احمد نواز، شاہد محمود انصاری، زین العابدین موتی والے نے بھی کہا کہ عامر شہزاد اپنی ادبی خدمات اور اپنے قلم کے جادو سے مقبولیت کے زینے چڑھ رہا ہے۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: رُکے ہوئے آنسو/مصنف: ممتاز راشد لاہوری/صفحات: 216 /تبصرہ نگار: محمد ظہیر بدر
ناشر: خیال وفن پبلشرز، لاہور

ممتاز راشد کی غزل میں روایت سے آشنائی اور کہیں کہیں کلاسیکیت کا تڑکا بھی ملتا ہے۔ان کی غزل میں کہیں کہیں جدت اور جدلیاتی عنصر در آیا ہے اور کہیں انہوں نے ثقیل بحریں بھی استعمال کی ہیں مگر ان خصائص کو ممتاز راشد نے جملہ محاسن شعری پر غلبہ نہیں کرنے دیا۔وہ ایک بھرپور ادیب، ادب اور ادیب دوست انسان ہے۔شاعری ہو یا نثر اور نثر میں کوئی بھی صنف،ان کی قلمی جولانیوں سے ہر صنف سخن بار وادب زار ہے۔ایک ادیب یا فنکار اپنی زندگی مختلف کیفیات،موضوعات،مصروفیات،ترجیحات اور واقعات وسانحات سے غور وفکر کشید کرتا ہے۔جبکہ اس کا فن اس غور وفکر کے نتیجے کو اظہار کا اسلوب اور پیشکش کا قرینہ بجھاتا ہے۔ممتاز راشد کی شاعری بھی کسی ایک موضع پر بند نہیں۔ان کا پیرایہ اظہار صرف محبت،ہجر وفراق اور آہ وگریہ تک محدود نہیں۔ممتاز راشد کے قطعات کے مجموعے کا عنوان اس کا یہ مصرع ہے ''ہم ہیں اپنے مزاج کے بندے'' یہ ایک مصرع نہیں بلکہ ممتاز راشد کی سرشت کا اظہار ہے۔چنانچہ ''کاوش'' سے لے کر اس مجموعہ کلام ''رکے ہوئے آنسو'' تک وہ تروتازہ وتوانا بہ صفت سیل رواں زندگی کی رعنائیوں، پہنائیوں اور گہرائیوں اور گیرائیوں کی طرف محو سفر ہے۔ہر چند بقول غالب: ع نے ہاتھ باگ پہ ہے نہ پا ہے رکاب میں

نام کتاب: کھیڈاں/مصنف: عبدالوحید بسمل/صفحات: 112 / قیمت: 175 روپے/تبصرہ نگار: سلطان سکون
ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

وحید بسمل بذات خود دیہاتی اور شہری زندگی کے اُتار چڑھاوٴ سے بخوبی واقف ہیں۔اس لیے ان کے ڈراموں میں بھی اس کا عکس ملتا ہے۔انھوں نے جس خوبصورتی اور مہارت سے دیہاتوں اور گھروں میں بولی جانے والی ہندکو کے خالص لہجے کو ثقافتی رنگ دے کر مختلف کرداروں سے کام لیا ہے وہ واقعی قابل ستائش ہے۔پھر اس کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا مزاح بھی شامل کر کے ڈراموں کو اصلاح کے علاوہ تفریح کا بھی اچھا ذریعہ بنا کر پیش کیا ہے۔ان کے ڈراموں میں شروع سے لے کر آخر تک نہ تو کہیں ربط ٹوٹتا ہے اور نہ ہی دلچسپی ختم ہوتی ہے۔سسپنس جو ڈرامے کا خاص وصف ہے اس کو بھی قائم رکھتے ہیں۔بھرپور کلائمکس اور اچھوتا اختتام ڈرامے کی مقبولیت کا ذریعہ ہوتے ہیں جس پر بسمل کو دسترس حاصل ہے۔

نام کتاب: کچے ڈاہلے پیہنگاں/مصنف: عبدالوحید بسمل/صفحات: 128 / قیمت: 250 روپے/تبصرہ نگار: پروفیسر آصف ثاقب
ناشر: مثال پبلشرز، رحیم سنٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

بسمل صاحب دا ہندکو مجموعہ کلام ''کچے ڈاہلے پیہنگا'' ہندکو شاعری دی پیش رفت دا اک سوہنڑا تے ستھرا باہدا اے۔بسمل صاحب نے ہندکو شعری روایات دے حسن تے نغمے دا استعمال بڑے کمال نال کیتا اے۔انہاں دی حمد، نعت سے سلام دی عقیدت پھری امیجری بے مثال اے۔آنڑیں والیاں نسلاں اس محبت تے عقیدت دی مثال سامنڑیں رکھسن۔

بسمل صاحب نے غزل دے کینوس بچ جیہڑا التغزلانہ رنگ روپ پیدا کیتا اے اوہ انہاں دا ہی حصہ اے۔ اتھے غزل دی موسیقیت تے نغمگی لوح پرور تے جان افروز اے۔ بسمل دی غزل پڑھنے دے لائق اے اس دے دل سوتھے جسم وجاں ہور محسوسات واسطے جنت نگاہ تے فردوس گوش نیں۔

ہندکو شاعری بچ نظم دی روایت کجھ زیادہ نویں ہینھ۔ نویں ہندکو شاعری بچ نظم نے ایسے پر پرزے کڈھے نے کہ ایہہ چھا گئی اے۔ بسمل دی نظم خوبصورت اے تے دل تے زیادہ اثر کرنے والی اے۔ آخری والے ویلے اندر انہاں دی نظم دی سرشاری رہسی۔ انہاں دی نظم ذوق، شوق نال پڑھی جلسی غرض عبدالوحید بسمل ہندکو دے نمایاں شاعر بنڑ کے سامنڑیں آئے نے، کتاب ''کچے ڈاہلے پیہنگاں'' ہندکو شاعری دا نواں منشور اے تے نویں نویں اسلوب دا قرینہ اے۔

نام کتاب: آتے ہیں غیب سے/مصنف: انور شعور/صفحات: 240/ قیمت: 500روپے/تبصرہ نگار: مبین مرزا
ناشر: رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی

عصری شعری تناظر میں انور شعور کا شمار ان تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جن کی تفہیم اور تعین قدر کے اعتبارات الگ ہوں گے۔ ہم انھیں مروّجہ قاعدوں اور مقررہ پیمانوں سے جانچنے پرکھنے کی کوشش کریں تو فہم میں نقص واقع ہونے کا خاصا امکان ہے۔ اس لیے نہیں کہ انور شعور نے اپنی شاعری میں ایسے مضامین تراشے ہیں یا اسلوب و آہنگ کے ایسے تجربات کیے ہیں جن پر بات کرنا ذرا دشوار ہے۔ ایسا تو نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے انور شعور کا رنگ سخن اور حرف سادہ اپنی تہ میں درد بادہ کی طرح کچھ ایسا ضرور رکھتا ہے کہ جس کا ذائقہ اور اثر ان کے قاری کو ایک کیفیت ......ایک الگ کیفیت سے ہم کنار کرتا ہے۔

یہ بات بہت سے لوگوں کو نہیں معلوم کہ انور شعور نے اردو کی کلاسیکی شاعری کا جیسا مبسوط اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، وہ کم ہی لوگ کرتے ہیں۔ مطالعہ وہ نعمت ہے کہ عمر بھر آدمی کو سیراب اور شاد کام رکھتی ہے۔ تخلیقی صلاحیت فطری ہوتی ہے، لیکن مطالعہ اس کو صیقل کرتا ہے اور آب دار بنا دیتا ہے۔ یہ جو سادہ کاری ہمیں انور شعور کے یہاں نظر آتی ہے، یہ دراصل تہ داری اور پرکاری کے ہنر کو جاننے اور سمجھنے کے بعد کے مرحلے کی ہے۔ یہ مرحلہ اُس وقت آتا ہے، جب تخلیق کار مشکلوں کو گھٹ میں اُتارنا اور اس طرح آسان بنانا سیکھ جاتا ہے جیسے سانس لینا۔ یہی سبب ہے کہ انور شعور کے یہاں بہت عام سی بات، روزمرہ کا کوئی معمولی واقعہ اور انسانی طرزِ احساس کا کوئی بہت سادہ رویہ بھی شعر کے قالب میں ڈھل کر چلا آتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب شاعر موضوعات اور مضامین کی کمی کا شکار نہیں، بلکہ بہتات سے دوچار ہوتا ہے۔ جب شعر کہنا اور زندہ رہنا گویا ایک ہی عمل کی دو جہتیں بن جاتی ہیں۔

نام کتاب: میرا عہد، جو میں نے لمحہ لمحہ جیا/مصنف: تنویر ظہور/صفحات: 200/ قیمت: 900روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی
ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ''میرا عہد'' یہ کتاب نہیں ایک عہد کی کہانی ہے اور یہ کہانی ہے ایک انسان کی، ایک کالم نویس کی، ایک ایڈیٹر کی یہ کہانی ہے تنویر ظہور کی اُس عہد کی جو اس نے لمحہ لمحہ جیا ہے۔ جہاں تنویر ظہور کی روداد حیات ہے وہاں ایک قاری کے لیے خزانہ معلومات ہیں۔ مشاہیر علم و ادب و فنونِ لطیفہ سے متعلق شخصیات سے ملاقات کو اس انداز میں ذکر کیا ہے کہ قاری تنویر ظہور کو اپنے سامنے بیٹھے اپنی زبانی بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تنویر ظہور کی زندگی طویل جدوجہد پر محیط ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز بھی ہمیں تو قدرت و وقت کے عطا کردہ انعامات کا ذکر بھی نہایت عاجزی سے کرتے ہیں۔ تنویر ظہور کی اس سوانح عمری میں زندگی کا ہر رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ سرورق بنانے میں اسلم کمال صاحب نے اپنے فن کمال سے کمال کر دیا ہے۔ سنگ میل پبلشنگ دنیا میں ایک معتبر نام ہے۔ بہترین کاغذ کے ساتھ عمدہ چھپائی کتاب کو جاذب نظر بناتی ہے۔ تنویر ظہور کے مداحوں کے علاوہ عام قاری بھی اس سرگزشت کو پڑھ کر متاثر ہوئے

بغیر نہیں رہے گا۔آپ بھی پڑھیے گا ضرور۔

نام کتاب: حسن نظر/مصنف:احسان اللہ شبیر/صفحات: 398 / قیمت: 800روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی
ناشر: مقصود پبلشرز، جیلانی سنٹر اُردو بازار، لاہور

گوشہ محققین ننکانہ صاحب کی طرف سے جید علما سے لے کر بلند پایہ صاحب بصیرت اور زیرک تعلیم یافتہ محققین کے تاثرات پر مبنی احسان اللہ شبیر کی تالیف کردہ مجلد کتاب حسن نظر ایک نہایت عمدہ تحریروں سے بجی ہوئی ان کی کاوشوں کا بہترین نمونہ ہے۔ان تحریروں کا محور و مرکز جناب پروفیسر سیّد شبیر حسین شاہ زاہد ہیں۔سید شبیر حسین شاہ زاہد صاحب خود ہی بلند پایہ مصنف و عالم ہیں۔اسلام کی ترویج و ترقی میں لکھی گئی اور پسند کی گئی کتابوں کی بھی تفصیل ہے۔دراصل یہ کتاب ''حسن نظر'' ان کی ان خدمات کا اعتراف ہے۔398 صفحات کی کتاب میں ایک لمبی فہرست ہے جو اس وقت ضبط تحریر لانے کی متحمل نہیں کہ تبصرہ میں جگہ اور الفاظ کی قید ہوتی ہے۔بطور نمونہ چند اسماء گرامی ملاحظہ ہوں۔مولانا مفتی جمیل احمد نعیمی، صوفی غلام سرور نقشبندی، ڈاکٹر انور سدید، صاحبزادہ محب اللہ نوری، پروفیسر ڈاکٹر نوید شہزاد، تنویر ظہور۔اس کتاب کو پڑھ کر سید شبیر حسین شاہ کی علمی، ادبی کاوشوں کے ساتھ ساتھ عوام الناس میں عزت وتکریم کا اندازہ ہوتا ہے۔گوشہ محققین نے تمام ترشحات قلم یکجا کر کے قارئین کے لیے سہولت مہیا کر دی ہے۔تاکہ آنے والے وقت میں اگر کوئی سید شبیر شاہ صاحب پر کام کرنا چاہے تو ایک ہی جگہ مواد مل سکتا ہے۔گوشہ محققین اس بات کے لیے شاباش کے مستحق ہیں۔

نام کتاب: بانگ جرس/شاعر:سیّد قاسم جلال/صفحات: 134 / قیمت: 200روپے/تبصرہ نگار: نازاوکاڑوی
ناشر: جران اشاعت گھر 102 عائشہ منزل اردو، کراچی

سیّد قاسم جلال ایک کہنہ مشق شاعر ہیں ان کی تالیفات کی تعداد 24 تک جا پہنچی ہیں اس تواتر کے ساتھ لکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ قاری ان کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی پسند کرتے ہیں۔آپ اردو، پنجابی اور سرائیکی میں شاعر کے علاوہ تحقیق، مقالات تنقید، ڈرامہ کے علاوہ ادیبوں کے انٹرویو بھی قلمبند کر چکے ہیں۔اس وقت ہمارا موضوع سیّد قاسم جلال کا متفرق جن میں قصائد اور مشاہیر کے بارے منظوم تاثرات اور آخر میں غزلیات ہیں۔اپنے ہم عصر دوستوں کو خراج تحسین ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔کتاب بالکل سادہ مگر بانگ درا کا سیکوئل ہے۔عمدہ کاغذ اور بہترین چھپائی کے ساتھ دیکھنے میں بھلی اور پڑھنے میں پرمغز دکھائی دیتی ہے۔اس اچھی کاوش پر سید قاسم جلال کو مبارکباد نہ دینا بخیلی ہوگی۔مجھے اُمید ہے قاسم جلال کی سابقہ کاوشوں کی طرح یہ کاوش بھی قارئین ذوق وشوق سے ضرور پڑھیں گے۔

نام کتاب: پنجابی بیت بازی/مرتب:نازاوکاڑوی/صفحات: 160 / قیمت: 300روپے/تبصرہ نگار: محمد نعیم یاد
ناشر: فجر پبلی کیشن، لاہور

مبارکباد اور تعظیم کے قابل ہیں وہ لوگ، جو روز پنجابی زبان کے سکڑتے ہوئے دائرے کو محسوس کرنے کے باوجود الیکٹرانک میڈیا کے چکا چوند میں ادب کے تئیں افراد کی کم ہوتی ہوئی دلچسپی کا درد رکھنے کے باوجود، پنجابی زبان میں تحقیق وتخلیق کے کام کو جاری رکھ کر نئی نسل تک ادب کو پہنچانے کا کام بخوبی سر

انجام دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس صارفی معاشرے میں اسے دیوانگی ہی تو کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ایسی دیوانگی ہے جس پر اس فرزندگی کو بے ساختہ قربان کیا جا سکتا ہے جو محض سود و نفع کا لحاظ کرنا سکھاتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''کسی بھی زبان یا اس کے ادب کی تاریخ درجہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی، جب تک اس کے گمشدہ اوراق کا سراغ نہ لگایا جائے یا اس کے منتشر شیرازکو مجتمع نہ کیا جائے۔''

دور حاضر میں پنجابی ادب کی ترویج و ترقی میں ایسے بے لوث لوگوں میں ناز اوکاڑوی جی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے جو پچھلے کئی سالوں سے پنجابی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے نہ صرف تخلیقی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں بلکہ تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایسا ادب پیش کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہ سکے۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''پنجابی بیت بازی'' شائع ہو کر میرے تک پہنچی تو از حد مسرت ہوئی۔ اس سے قبل پنجابی زبان میں بیت بازی کے حوالے سے کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ ناز اوکاڑوی جی نے جس خوش اسلوبی سے اس تحقیقی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے وہ ان کی پنجابی زبان سے عشق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کتاب ''پنجابی بیت بازی'' میں ناز اوکاڑوی جی نے حروف تہجی کے حساب سے شاعروں کی بڑی دنیا سمیٹی ہے۔ استاد دامن، صائم چشتی، عاشق رحیل، ڈاکٹر یونس احقر، صوفی غلام تبسم، پیر فضل شاہ گجراتی، فرحت عباس شاہ، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر صغریٰ صدف اور نہ جانے کتنے شعرا کی شاعری کو سمیٹ کر شعروں کا خوبصورت مینا بازار لگایا ہے۔ اس کتاب میں ناز اوکاڑوی جی کی فکر، ذہانت اور تحقیق کا وہ رس موجود ہے جو ہر قاری کو ان شعرا کے اشعار پڑھنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ''کاش! میں یہ کام کر سکتا۔''

عربی زبان کے ایک بڑے نقاد سے کسی نے پوچھا تھا کہ ''آپ کی نظر میں سب سے اچھا شعر کون سا ہے؟''

نقاد نے جواب دیا ''وہ شعر جسے پڑھنے یا سننے کے بعد ہر کوئی یہ کہنے لگے کہ ایسا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں، لیکن جب وہ کہنے کی کوشش کرے تو کہہ نہ پائے۔''

''پنجابی بیت بازی'' کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ ناز جی ان حالات میں یہ کتاب مرتب کر کے اس بات پہ مہر ثبت کر دی ہے کہ پنجابی زبان کے یہ بے لوث خدمت کار پنجابی زبان کی ترویج و ترقی میں اپنا حصہ ڈالتے رہیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ناز جی نے بیت بازی کی اس کتاب میں جن شعروں کا تڑکا لگایا ہے قاری پنجابی زبان میں اس کا ذائقہ ضرور محسوس کرے گا اور تخلیقی حسیت اور بصیرت سے بھرپور پنجابی میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب یقیناً مشعل راہ ثابت ہو گی اور محرک بنے گی۔

اس کتاب کی اشاعت پر میں ناز اوکاڑوی جی کو اپنے دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں۔ خدا کرے کہ اس کتاب کو اعتبار کی سند ملے۔

روز اک خواب مرے دل میں اُتر جاتا ہے　　جانے کس سمت سے آتا ہے کدھر جاتا ہے

منفرد لہجے کے شاعر آصف **شفیع** کا شعری مجموعہ

ترے ہمراہ چلنا ہے

سعد پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہو گیا ہے

قیمت: 200 روپے　　صفحات: 160

نامہ ہائے احباب

حسن عباسی صاحب!

شعرآثار تغزل رنگ، تغزل نما

السلام علیکم۔ ارژنگ کی نثری اور شعری مینا کاریوں سے سرشاری نصیب ہوئی۔ آپ کی کرشماتی ادارت کی خوبی دل کو شاد آباد کرتی ہے۔ پھر وہی مسئلہ کمپوزنگ کا۔ آپ نے میرا عروضی خط شائع کیا مہربانی آپ کی ''ارکان'' کمپوزنگ سے بگڑ گئے ہیں۔ فعلن (ف ع ل ن) کو بلاوجہ مفعولن کر دیا گیا ہے۔ شروع میں ''م'' کی ضرورت نہ تھی۔ ایک جگہ فعول (ف ع و ل) کو مفعول بنا دیا گیا ہے۔ بات مفاعلاتن، مفاعلاتن، مفاعلاتن بقوے بحر جمیل کے ضمن میں تھی میں نے چند وضاحتیں کی تھیں۔ عروض پر قلم اُٹھانا دل گردے کا کام ہے جو اٹھاتا ہے وہ نچلا نہیں بیٹھتا۔ بل کہ اپنی سی کر دکھاتا ہے۔ اس ''بحر جمیل'' سے متعلق ایک پرانے رموز فن کے ماہر شفق رضوی کا ارشاد ہے۔

ناسخ کی ایک غزل کا مصرع لیجیے

قیامِ شیخ قضائے جرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

فعول فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن، فعول فعلن

(ف ع ول)

ایک صاحب نے اسی کے اوزان بنا دیے

مفاعلاتن، مفاعلاتن، مفاعلاتن

م ف اع ل ات ن

تقطیع بھی کر کے دکھا دی اب اُن سے کون کہے حضرت یہ وزن ایجاد بندہ کسی بحر کا نہیں۔

میری ناقص رائے میں بحر جمیل کا ''بوٹا'' تنگ دھڑنگ کھڑا نہیں ہوسکتا۔ اس کی شاخیں ہے اور جڑیں تو ہوں۔ میں نے اپنی بدخطی اور آپ کی کمپوزنگ کے ڈر سے کلام نہیں بھیجا۔ مجھے ایک دو بار تلخ تجربہ ہوا ہے۔ ورنہ ''ارژنگ'' کے سے باغ و بہار پرچے میں کلام کی اشاعت اعزاز کی بات ہے۔ احمد عقیل روبی مرحوم کے خصوص میں خورشید رضوی کا مضمون خاصا خوش ذائقہ ہے۔ پسند آیا۔

میری کتاب ''درکنار'' (شاعری) کی لاہور کی تقریب رونمائی میں روبی مرحوم اور رضوی صاحب نے اظہار خیال کیا تھا۔ اس طرح میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ مضمون رسالہ بیاض مئی ۲۰۰۹ء میں نکلے تھے۔ احمد عقیل روبی کی خاکہ نگاری سے متعلق خورشید رضوی کی لائنیں خوب صورت ہیں۔ بڑا فنکار آخر بڑا فن کار ہوتا ہے۔ افسانے افسانوی خوبو رکھتے ہیں، خوب ہیں۔ افسانہ ''اندر کا رنگ'' پہلے بھی کہیں پڑھا ہے۔ اس کا فن ''پائندگی'' کا حامل ہے۔ شبہ طراز شاعری میں بھی دست و قلم ہیں اور افسانے بھی اچھے لکھتی ہیں۔ محترمہ عذرا اصغر کی لاڈلی جو ہوئیں۔ ایوب صابر بھی قلم کے دھنی لگتے ہیں۔ ان کو پہلے تو اتنا نہیں دیکھا۔ اب دیکھنے لگا ہوں۔ ادھر ہمارے ہاں بھی ایک ایوب صابری پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر پرائڈ آف پرفارمنس ماہر اقبال شناس پرانے لکھنے والے۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے ان سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ''سینئر گدھے'' از عطا الحق قاسمی صاحب ہنسانے والا ہے (رلاتا بھی ہے) عطا الحق قاسمی صاحب پی ٹی وی کے سربراہ ہیں۔ ان سے زمانے کی یاد اللہ ہے۔ ان کا تعلق وزیر آباد سے رہا ہے (ابھی ہے) میرا ننھیال بھی مشن برج وزیر آباد ہے۔

وزیر آباد بھلے بھلے اہل دانش نامور ہوئے ہیں۔ اپنے منو بھائی بھی وہیں سے نکلے ہیں۔ وہاں کے شفقت تنویر مرزا بہت یاد آتے ہیں۔ خدا اعجاز کنور راجا اور راجا صادق اللہ کو سلامت رکھے۔ زاہد مسعود بھی۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' جولائی ۲۰۱۷ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ''آرٹ گیلری میں بیتھوون کی چاندنی راتیں'' مستنصر حسین تارڑ کا مضمون ایک یادگار تخلیق ہے۔ ''اُردو غزل......اقبال کے بعد'' خاور اعجاز کا مضمون بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال کی زندگی میں اور ان کے بعد شعرا نے ان کے رنگ تغزل سے استفادہ کیا اور اقبال کے موضوعات کو اپنی شاعری میں سمویا۔ عطاء الحق قاسمی کا مضمون ''سینئر گدھے'' بزرگ شعرا کے لیے ناگوار

خاطر ہوگا لیکن یہ مضمون ان کی افتادِ طبع کے مطابق ہے۔ مزاح کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ ''اردو کے پھیلتے عالمی دائرے'' اور ''ارژنگ کا ارتقا'' میری معلومات میں اضافہ کا باعث ہیں۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' تیزی سے ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔

جدید اسلوب پر مبنی اُردو غزلیں بہت پسند آئیں۔ حمد اور نعت پر آپ خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ حمد اور نعت میں قابل قدر کلام طمانیت کا باعث ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام کی شان اقدس میں ایک منقبت ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ پسند فرمائیں گے۔ ارژنگ کے شعبہ ادارت سے وابستہ تمام لوگوں کو میرا اسلام کہیے۔

خیر اندیش

مظفر حسن منصور، جوہر آباد

محترم جناب حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ''ارژنگ کے لیے ایک غزل ارسال خدمت ہے۔ کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے دیں۔ مہربانی ہوگی۔ اُمید ہے آپ معہ اہل خانہ خیریت سے ہوں گے۔ آمین

نصرت صدیقی، فیصل آباد

محترم حسن عباسی صاحب

(مدیر ماہنامہ ''ارژنگ'' لاہور)

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''ارژنگ'' کا شمارہ مئی 2017ء نظر نواز ہوا۔ اپنی زریں روایات کو تسلسل کے ساتھ نبھانے والا یہ رسالہ یقیناً عصری ادب کا ایک مستند رسالہ ہے۔ جس کے لیے برادرم عامر بن علی اور آپ بجا طور پر داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ آپ پروف خوانی پر جتنی توجہ دیتے ہیں وہ بھی لائق تحسین ہے۔ ''ارژنگ'' میں پروف کی اغلاط بمشکل ہی نظر آتی ہیں۔ مذکورہ بالا شمارہ میں البتہ دو اغلاط ملیں جو کافی دلچسپ بھی تھیں۔ مثلاً صفحہ 29 پر غزل کے ساتھ شاعر کا نام ہمایوں پرویز شاہد کی بجائے ''ہمایوں پر ہیز شاہد'' شائع ہوگیا ہے اور صفحہ 32 کی غزل کے نیچے ''تسنیم کوثر'' کا نام ہے۔ جبکہ مقطع میں تخلص ''ساجد'' لکھا ہوا ہے۔ خیر یہ تو ''اشاعت'' کے میدان کی معمولی اغلاط ہیں ورنہ تو اس طرح کی کوتاہیاں بڑی تعداد میں رسالوں کا حصہ ہوتی ہیں۔ مذکورہ شمارہ میں آپ نے میری تخلیق کردہ ''حمد'' شائع کی ہے اور ملتان میں میرے ناول ''نازی نواز'' کی تقریب رونمائی کی روداد بھی سراپا سپاس ہوں۔ سلامت رہیں۔

خیر اندیش

ممتاز راشد لاہوری، لاہور

محترمہ لبنیٰ صدر صاحبہ!

سلام مسنون۔ آپ کا محبت بھرا مسیج ارژنگ کے لیے تخلیقات بھیجنے کا آیا تو بہت خوشی ہوئی۔ برادرم حسن عباسی سے دیرینہ دوستی اور محبت ہے۔ کسی زمانے میں جب میں جدہ، سعودی عرب میں تھا تو یہ خوبصورت جریدہ مجھے وہاں بھی ملا کرتا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ راولپنڈی آنے کے بعد اس کی ترسیل بند ہوگئی۔ ایک دو مرتبہ برادرم حسن عباسی سے یہاں ملاقات بھی ہوئی اور ان سے درخواست بھی کی کہ پرچہ میرے نام جاری کر دیں (مطلب وی پی پی سے تھا) مگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا۔

اب آپ نے حکم دیا ہے تو اس حکم کی تعمیل میں کچھ چیزیں بھیج رہا ہوں، اپنی دو عدد تازہ کتب بھی اور ساتھ ہی ایک درخواست بھی بھیج رہا ہوں کہ پرچہ میرے نام جاری کر دیں۔ (مطلب اب بھی وی پی پی سے ہے)

اُمید ہے کہ میری کتابوں پر بھی تبصرہ ''ارژنگ'' کے کسی شمارے میں شائع کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گی۔

برادرم حسن عباسی کو میرا مودبانہ اور مخلصانہ سلام

خیر اندیش

نسیم سحر، اسلام آباد

جناب حسن عباسی صاحب! آداب

اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ''ارژنگ'' موصول ہوگیا۔ بہت شکریہ!! بس اس دفعہ اس میں میری کوئی تحریر شامل نہیں تھی۔ خیر یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ ہر دفعہ چھپا جائے۔ ''ارژنگ'' اپنے رنگ ڈھنگ میں اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کا مضمون بہت اچھا لگا۔ ''ارژنگ کا ارتقا'' عامر بن علی صاحب کا زبردست اور معلوماتی مضمون ہے پڑھ کر لطف آیا۔ عطاالحق قاسمی صاحب تو خیر لکھتے ہی اتنا عمدہ ہیں کہ کیا کہوں۔ جنگ میں ان کا کالم بطور خاص پڑھتی ہوں۔ افسانے اور شاعری بھی عمدہ ہے۔ سلامت رہیے!!

کوئی عمدہ ادبی پروگرام رکھیں تو ضرور دعوت دیا کریں۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

آسناتھ کنول، لاہور

انتہائی واجب القدر، ذی احتشام

عامر بن علی (مدیراعلیٰ) ماہنامہ ''ارژنگ'' لاہور

عریضہ سلام: امید واثق ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

سر میرا تعلق ضلع جھنگ کی آخری تحصیل احمد پور سیال سے ہے۔ میرا نام اسد رضا اور تخلص سحر ہے۔ سر پنجاب یونیورسٹی سے 2010 میں ماسٹر کر رکھا ہے اور 2006 سے تھوڑا بہت لکھنا بھی شروع کیا۔ ابھی تک سیکھنے کے مرحلہ میں ہوں۔ سر پچھلے دنوں میرے نواحی موضع میں میرے جاننے والے بزرگ شاعر محمد حسین عارف رہتے ہیں جہاں میں ان سے ملنے گیا۔ وہاں پہنچا تو کافی دیر گپ شپ ہوئی۔ واپسی پر مجھے انہوں نے ایک ماہنامہ دیا اور کہا کہ بیٹا اس کا بغور مطالعہ کرنا اور اگر ہو سکے تو لکھوا بھی لینا۔ جناب عالی میں نے غور کیا تو ماہنامہ ارژنگ لاہور تھا میں گھر لے آیا جیسے ہی مجھے کام کاج سے فراغت ہوئی میں نے ماہنامہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یقیناً ہی ہر صفحہ چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ ادبی حلقوں کا ترجمان ماہنامہ ''ارژنگ'' اپنی مثال آپ ہے۔

جناب عالی! یہ شمارہ نومبر 2016 کا ہے میری استدعا ہے کہ مجھے اس کا باقاعدہ ممبر بناتے ہوئے ہر ماہ بھیجا جائے جو واجبات ہوں گے میں ادا کرنے کا پابند رہوں گا۔ دو غزلیں پیش خدمت ہیں مناسب لگے تو ایک ایک کر کے آئندہ شماروں میں کسی کونے میں جگہ عنایت فرمادیں۔ پوری ٹیم کے لیے سراپا دعا ہوں۔

والسلام

اسد رضا سحر

جناب حسن عباسی صاحب!

مدیر ارژنگ لاہور۔ آداب

میں ادب سے گہری دلچسپی رکھتا ہوں۔ آپ کی نظروں میں ادب پہلا قرینہ ہے۔ آپ سے روابط چاہتا ہوں۔ آپ کے ملک بھر میں متعدد ادبی احباب دوست ہوں گے۔ ان سے بھی رابطہ ہو جائے تو ان کے ایڈریس/ پتے دیں۔ آپ کے ماہنامہ ''ارژنگ'' کی اعزازی بھی ارسال کر دیں۔ شکریہ!!

آپ سے ہو سکے تو ہماری رہنمائی کریں۔ ہمیں گائیڈ لائن دیں۔ رہبری کریں۔

آپ کے تعاون اور مثبت جواب اور طلب گار و منتظر۔ والسلام

شری مرلی چند رگوپی چند

شکار پور، سندھ

حسن عباسی! دعائیں

''ارژنگ'' مل گیا۔ تمہاری لگن کے نقوش سمیٹے ہوئے عمدہ شاعری، افسانے اور مضامین لیے۔ اچھی کاوش ہے ہر ماہ ایک خوبصورت گلدستہ سجاتے ہو اور اپنے قارئین کو اس کی مہک سے مسحور کر دیتے ہو۔

ایک افسانہ ارژنگ کے لیے۔ اس سے پہلے بھی ''زرد پھول اداس موسم'' آپ کو بھیجا تھا مگر ارژنگ میں وہ شامل نہ ہوا۔ جانے کہاں روپوش ہو گیا۔ بہر حال آپ کی محبتوں کا شکریہ!!

تسنیم کوثر، لاہور

غزلیات/عمران شناور

گام گام خواہشیں
ناتمام خواہشیں
ہر خوشی کی موت ہیں
بے لگام خواہشیں
لے ہی آئیں آخرش
زیرِ دام خواہشیں
ہوش میں نہیں ہوں میں
صبح و شام خواہشیں
کاٹتی ہیں روح کو
بے نیام خواہشیں

....

ہو رہا ہے کیا یہاں کچھ عقدۂ محشر کھلے
اب فصیلِ تیرگی میں روشنی کا در کھلے
'کتنا اچھا دور تھا' ہم نے بزرگوں سے سنا
چھوڑ کر جاتے تھے جب ہم اپنے اپنے گھر کھلے
سوچتے تھے زندگی میں اب کوئی مشکل نہیں
ایک کا حل مل گیا تو مسئلے دیگر کھلے
تُو مری شہ رگ کے اتنا پاس کیسے ہو گیا
سوچنے بیٹھا تو کیا کیا آگہی کے در کھلے
ڈوب کر ' بحرِ سخن کا میں شناور ہو گیا
ایک پل میں زندگی کے کتنے ہی جوہر کھلے

اٹلی میں مقیم نامور ادیب، شاعر اور ناول نگار

جیم فے غوری

سے

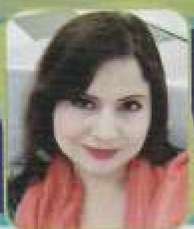

لبنیٰ صفدر کی گفتگو

ادیب اپنے معاشرے کا قرض دار ہوتا ہے اور قرض کو وہ یوں اتار سکتا ہے کہ جس معاشرے میں وہ زندہ ہے اس کو امن، محبت اور انصاف کا پیغام دے

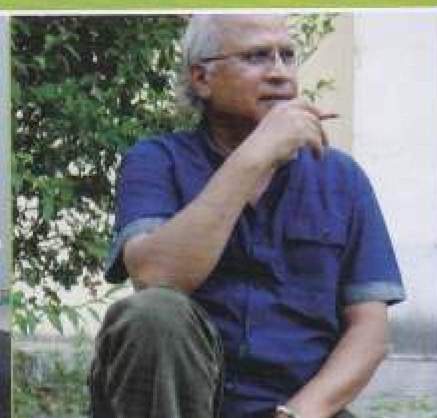

شعر کا تعلق سماج کے رسم و رواج اور انسانی جذبوں اور احساسات سے ہونا چاہیے

ارژنگ: آپ کا پورا نام اور ادبی نام؟

جیم فے غوری: جس دن میں پیدا ہوا اس دن کی مناسبت سے میرا نام رکھا گیا، پچیس دسمبر (۲۵) کو شروع ہوئے ابھی پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی اس دن کرسمس کی عبادت کے بعد ایک اٹالین پریسٹ ہمارے گھر تشریف لائے اور اس اہم دن کی مناسبت سے اردو میں یوسف اور انگریزی میں جوزف کہہ کر مجھے بلایا یہاں پر نام ختم نہیں ہوا اس کے ساتھ والد کا نام جوڑا گیا اور اس کے آگے ذات کا نام غوری بھی لگایا گیا میں نے ہائی سکول میں کہانی لکھنی شروع کی اور کالج میں جا کر نظم کہنی شروع کی ایک بار نذیر قیصر نے اپنے ادبی رسالہ نقطہ نظر میں جو اس وقت وہ ملتان سے نکالتے تھے اور میری ایک نظم شائع کی اور میرے انگریزی اور اردو نام کو مکمل اردو میں جیم فے غوری لکھا تب سے میرا ادبی نام یہی ہے۔

ارژنگ: اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جیم فے غوری: افغانستان کے علاقے غور سے ہماری نسل کا تعلق ہے گیارہویں صدی میں بادشاہ محمد غوری کے ساتھ اس کی فوج میں اہم خدمات سرانجام دیتے ہوئے جب لاہور سے ہوتے ہوئے بغاوتوں اور ریاستی معاملات درست کرنے

بقیہ اندرونی صفحات پر

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com

Design By: 0300-4526821
MUHAMMAD AHSUN Gull